شگفتہ ناہید
نومبر ۱۹۸۲ء
انتیسواں دن

پت جھڑ کی آواز

قرۃ العین حیدر کی دیگر کتب

۱۔ کارِ جہاں دراز ہے

۲۔ ہمیں چراغ ہمیں پروانے

۳۔ آگ کا دریا

۴۔ آدمی کا مقدّر

۵۔ گلگشت

۶۔ کوہ دماوند

۷۔ جہانِ دیگر

۸۔ ماں کی کھیتی

۹۔ جہاں پھول کھلتے ہیں

۱۰۔ جگنوؤں کی دنیا

۱۱۔ تلاش

۱۲۔ آپس کے گیت

۱۳۔ فصلِ گل آئی یا اجل آئی

۱۴۔ ڈنگو

۱۵۔ تین ناولٹ

پت جھڑ کی آواز

قرۃ العین حیدر

مکتبہ اُردو ادب

بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر ——— سرفراز احمد
مطبع ——— زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
قیمت ——— ۲۴ روپے

سلمیٰ صدیقی

کے

نام

ترتیب

ڈالن والا	۹
جلا وطن	۳۸
یاد کی اِک دھنک جلے	۸۴
قلندر	۱۲۴
کارمن	۱۴۶
ایک مکالمہ	۱۶۱
پت جھڑ کی آواز	۱۸۲

ڈالن والا

ہر تیسرے دن سہ پہر کے وقت ایک بے حد دُبلا پتلا بوڑھا گھسے اور جگہ جگہ سے چمکتے ہوئے سیاہ کوٹ پتلون میں ملبوس سیاہ گول ٹوپی اوڑھے پتلی کمان والے چھوٹے چھوٹے شیشوں کی عینک لگائے ہاتھ میں چھڑی لئے برساتی میں داخل ہوتا اور چھڑی کو آہستہ آہستہ بجری پر کھٹکتا فقیرا باہر آکر بابو جی کو آواز دیتا ــــ بیٹا چلئے سائمن صاحب آگئے بوڑھا باہر ہی سے باغ کی سڑک کا چکر کاٹ کر پہلو کے برآمدے میں پہنچتا۔ ایک کونے میں جاکر اور جیب میں سے میلا سا رومال نکال کر جھکتا اور پھر آہستہ سے پکارتا ریشم۔ ریشم۔ ریشم ریشم دوڑتی ہوئی آتی۔ باجی بڑے آرٹسٹک انداز میں سرود گندھے سے گندھا برآمدے میں نمودار ہوتیں تخت پر بیٹھ کر سرود کا سرخ بنارسی غلاف اتارتیں اور سبق شروع ہوجاتا۔

بارش کے بعد جب باغ بھیگا بھیگا سا ہوتا اور ایک انوکھی سی تازگی اور خوشبو ہوا میں تیرتی تو بوڑھے کو واپس جاتے وقت گھاس پر گری کوئی خوبانی مل جاتی وہ اسے اُٹھا کر جیب میں رکھ لیتا۔ اکثر ریشم شکار کی تلاش میں جھاڑیوں کے اندر غائب ہوجاتی یا کسی درخت پر چڑھ جاتی تو بوڑھا سر اُٹھا کر ایک لمحے کے لئے درخت کی ہلتی ہوئی شاخ کو دیکھتا اور پھر سر اُٹھا کر پھاٹک سے باہر چلا جاتا۔ تیسرے روز سہ پہر کو پھر اسی طرح بجری پر چھڑی کھٹکھٹانے کی آواز آتی۔ یہ معمول بہت دنوں سے جاری تھا۔

جب سے پڑوس میں مسز جوگ مایا چڑ جی کلکتے سے آن کر رہی تھیں۔ اس محلے کے باسیوں کو بڑا سخت احساس ہوا تھا۔ کہ ان کی زندگیوں میں کلچر کی بہت کمی ہے۔ موسیقی کی حد

تک ان سب کے گول کمروں میں ایک گرامو فون رکھا تھا ابھی ریڈیو عام نہیں ہوئے تھے۔ فریجڈیر نہیں بنا تھا۔ ٹیپ ریکارڈ ایجاد نہیں ہوئے تھے اور سماجی رتبے کی (STATUS SYMBOL) علامات ابھی صرف کوٹھی کار اور بیرے پر مشتمل تھیں۔ لیکن جب مسز جوگ مایا چٹرجی کے وہاں صبح و شام ہارمونیم کی آوازیں بلند ہونے لگیں تو سروے آف انڈیا کے اعلیٰ افسر کی بیوی مسز گوسوامی نے محکمہ جنگلات کے اعلیٰ افسر کی بیوی مسز فاروقی سے کہا —— بہن جی ہم لوگ تو بہت ہی بیکورڈ رہ گئے۔ ان بنگالیوں کو دیکھئے۔ ہر چیز میں آگے ہیں ——

اور میں نے تو یہاں تک سنا ہے۔ کہ ان لوگوں میں جب تک لڑکی گانا بجانا نہ سیکھے اس کا بیاہ نہیں ہوتا۔ ملٹری اکیڈیمی کے اعلیٰ افسر کی بیوی مسز جسونت سنگھ نے اظہار خیال کیا۔

ہم مسلمانوں میں تو گانا بجانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مگر آج کل زمانہ دوسرا ہے۔ میں نے تو اس سے کہہ دیا ہے۔ میں اپنی حمیدہ کو ہارمونیم ضرور سکھاؤں گی۔ مسز فاروقی نے جواب دیا۔

اور اس طرح رفتہ رفتہ ڈالن والا میں آرٹ کلچر کی ہوا چل پڑی۔ ڈاکٹر سنہا کی لڑکی نے ناچ سیکھنا بھی شروع کر دیا۔ ہفتے میں تین بار ایک مغنی سے ڈانس ماسٹر اس کے گھر آتے۔ انگلیوں میں سلگتی ہوئی بیڑی تھامے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتے جو جی جی کت ناتوم ترنگ تکا تن تن وغیرہ الفاظ پر مشتمل ہوتیں وہ طبلہ بجاتے رہتے اور اوشا سنہا کے پاؤں توڑوں کی چک پھیریاں لیتے لیتے گھنگرو کی چوٹ سے زخمی ہو جاتے۔ پڑوس کے ایک نوجوان رئیس سردار امرجیت سنگھ نے وائلن پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ سردار امرجیت سنگھ کے والد نے ڈچ ایسٹ انڈیز کے دارالحکومت بٹاویا۔ میں جواب جمہوریہ انڈونیشا کا دارالسلطنت جکارتا کہلاتا ہے۔ بزنس کر کے بہت دولت جمع کر لی تھی۔ سردار امرجیت سنگھ ایک شوقین مزاج رئیس تھے جب وہ گرامو فون پر بڑے انہماک سے نیو کا ریکارڈ

خزاں نے آکے چمن کو اجاڑ دینا ہے
مری کھلی ہوئی کلیوں کو لوٹ لینا ہے

بار بار نہ بجاتے تو دریچے میں کھڑے ہو کر وائلن کے تاروں پر سے انہماک سے گز ند گڑا کرتے ورنہ پھیری والے بزازوں سے رنگ برنگی چھینٹوں کی جار جٹ اپنے صافوں کے

لئے خریدتے رہتے اور یہ بڑھیا بڑھیا صافے باندھ کر اور داڑھی پر سیاہ پٹی نفاست سے چڑھا کر مسٹر فلک ناز مرزا بدخان سے ملاقات کے لئے چلے جاتے اور اپنی زوجہ سرمارنی بی بی چرن جیت کور سے کہہ جاتے کہ وائلن سیکھنے جا رہے ہیں۔ اسی زمانے میں باجی کو سرود کا شوق پیدا ہوا۔

وہ موسم سرما گوناگوں واقعات سے پُر گزرا تھا سب سے پہلے تو ریشم کی ٹانگ زخمی ہوئی پھر موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلانے والی مسنر زہرہ ڈربی نے آکر پر بڈ گراؤنڈ پر اپنے جھنڈے گاڑے ڈائنا ٹکیٹ قتالۂ عالم حسینۂ لندن کہلائی۔ ڈاکٹر مس زبیدہ صدیقی کو رات کو دو بجے گدھے کی حجامت کا کتا نظر آیا مسٹر پیٹر رابرٹ سردار خان ہماری زندگیوں سے غائب ہو گئے نیکس نے خودکشی کر لی اور فقیرا کی بھاوج گوریا چڑیا بن گئی۔

چونکہ یہ سب نہایت اہم واقعات تھے لہٰذا میں سلسلے وار ان کا تذکرہ کرتی ہوں۔

میری بہت خوبصورت اور پیاری ریحانہ باجی نے جو میری چچا زاد بہن تھی۔ اسی سال بی اے کیا تھا اور وہ علی گڑھ سے چند ماہ کے لئے یہاں آئی ہوئی تھیں۔ ایک سہانی صبح باجی سامنے کے برآمدے میں کھڑی ڈاکٹر ہون کی بیوی سے باتوں میں مصروف تھیں کہ اچانک برساتی کی بجری پر ہلکی سی کھٹ پٹ ہوئی اور ایک نحیف اور منحنی سے بوڑھے نے بڑی دھیمی اور ملائم آواز میں کہا: میں نے سنا ہے یہاں کوئی لیڈی سرود سیکھنا چاہتی ہیں۔

باجی کے سوالات پر انہوں نے صرف اتنا کہا کہ ان کی ماہانہ فیس پانچ روپے ہے۔ اور وہ ہفتے میں تین بار ایک گھنٹہ سبق دیں گے۔ وہ کرزن روڈ پر پادری اسکاٹ کی خالی کوٹھی کے شاگرد پیشے میں رہتے ہیں ان کے بیوی بچے مر چکے ہیں اور برسوں سے ان کا ذریعہ معاش سرود ہے جس کے ذریعے وہ آٹھ دس روپے مہینہ کما لیتے ہیں۔

لیکن اس نوابیدہ شہر میں سرود سیکھنے والے ہی کتنے ہوں گے۔ باجی نے پوچھا۔

انہوں نے اپنی دھیمی آواز میں کہا۔ کبھی کبھی دو ایک طالب علم مل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے متعلق کچھ نہیں بتلایا۔ وہ انتہائی خوددار انسان معلوم ہوتے تھے۔

ان کا نام سائمن تھا۔

پیر کے روز وہ ٹیوشن کے لئے آ گئے باجی پچھلے لان پہ دھوپ میں بیٹھی تھی۔ مسٹر سائمن کو یہیں بھیج دوا نہوں نے فقیرا سے کہا۔ باجی کی طرف جانے کے لئے فقیرا نے ان کو اندر بلا لیا۔ اس روز بڑی سردی تھی اور میں اپنے کمرے میں بیٹھی کسی سٹرپڑھ میں محو تھی۔ میرے کمرے میں سے گزرتے ہوئے ذرا ٹھٹھک کر سائمن نے چاروں طرف دیکھا۔ آتش دان میں آگ لہک رہی تھی ایک لحظے کے لئے ان کے قدم آتش دان کی سمت بڑھے اور انہوں نے آگ کی طرف ہتھیلیاں پھیلائیں مگر پھر جلدی سے فقیرا کے پیچھے پیچھے باہر چلے گئے۔ ریشم نے بہت جلد ان سے دوستی کر لی۔ یہ بڑے تعجب کی بات تھی کیونکہ ریشم بے انتہا مغرور اور کل کھری اور اپنے سیالی حسن پہ بے حد نازاں تھی اور بہت کم لوگوں کو خاطر میں لاتی تھی۔ زیادہ تر وہ اپنی ساٹن کے ریشمی جھالر دار غلاف والی ٹوکری کے گدیلوں پر آرام کرتی رہتی اور کھانے کے وقت بڑی مکاری سے آنکھیں بند کر کے میز کے نیچے بیٹھ جاتی۔ اس کی ساری خاصیتیں ویمپ (VAMP) عورتوں کی ایسی ہیں۔ باجی کہتی عورت کی خاصیت بلی کی ایسی ہوتی ہے چمکارو تو پنجے نکال لے گی بے رخی برتو تو خوشامد شروع کر دے گی ــــ

اور آدمی لوگوں کی خاصیت کیسی ہوتی ہے باجی؟ میں پوچھتی باجی ہنسنے لگتیں اور کہتیں یہ ابھی مجھے معلوم نہیں۔

باجی چہرے پہ دلفریب اور مطمئن مسکراہٹ لئے باغ میں بیٹھی مظفر بھائی کے بے حد دلچسپ خط پڑھا کرتی جو ان کے نام ہر پانچویں دن بمبئی سے آتے تھے۔ جہاں مظفر بھائی انجینئرنگ پڑھ رہے تھے۔ مظفر بھائی میرے اور باجی کے چچازاد بھائی تھے اور باجی سے ان کی شادی ہو چکی تھی۔ جتنی دیر وہ باغ میں بیٹھتی عفورہ بیگم ان کے نزدیک گھاس پہ پان دان کھولے بیٹھی رہتی جب باجی اندر چلی جاتی تو عفورہ بیگم شاگرد پیشے کی طرف جا کر فقیرا کی بھاوج سے باتیں کرنے لگتیں یا پھر اپنی نماز کی چوکی پہ آ بیٹھتیں۔

عفورہ بیگم باجی کی بے حد وفادار انا تھیں۔ ان کے شوہر تے جن کی علی گڑھ میں میرس روڈ کے چوراہے پر سائیکلوں کی دکان تھی پچھلے برس ایک نوجوان لڑکی سے نکاح کر لیا تھا۔

اور تب سے غفور بیگم اپنا زیادہ وقت نماز روزے میں گزارتی تھیں۔

سامن کے آتے ہی ریشم دبے پاؤں چلتی ہوئی آکر خرخر کرنے لگتی اور وہ فوراً جیب سے رومال نکال کر اسے کچھ کھانے کو دیتے۔ شام کے وقت جب فقیرا ان کے لئے چائے کی کشتی لے کر برآمدے میں جاتا تو وہ آدھی طشتری میں ڈال کر فرش پر رکھ دیتے اور ریشم فوراً طشتری چاٹ جاتی اور فقیرا بڑبڑاتا۔ ہمارے ہاتھ سے تو رانی دودھ پینے میں بھی نخرے کرتی ہیں۔

فقیرا ایک ہنس مکھ گھڑوالی نوجوان تھا۔ دو سال قبل چیتھڑوں میں ملبوس نہر کی منڈیر پر بیٹھا اون اور سلائیوں سے موزے بن رہا تھا جو پہاڑوں کا عام دستور ہے تو سکھ نندن خانساماں نے اس سے پوچھا تھا۔ کیوں بے نوکری کرے گا ــــــ؟ اور اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا۔ "مہینوں سے بھوکوں مر رہا ہوں۔ کیوں نہیں کروں گا۔" تب سے وہ ہمارے یہاں اوپر کا کام کر رہا تھا۔ ایک روز اس نے اطلاع دی تھی کہ اس کے دونوں بڑے بھائیوں کی مٹی ہو گئی ہے اور وہ اپنی بھاوج کو لینے گڑھوال جا رہا تھا اور چند دنوں بعد اس کی بھاوج دھر پہاڑوں سے آکر شاگرد پیشے میں بس گئی تھی۔

جل دھرا ادھیڑ عمر کی ایک گوری چٹی عورت تھی جس کے ماتھے ٹھوڑی اور کلائیوں پر نیلے رنگ کے نقش و نگار کھدے ہوئے تھے۔ وہ ناک میں سونے کی لونگ اور بڑا سا بلاق اور کانوں کے بڑے بڑے سوراخوں میں لاکھ کے پھول پہنتی تھی اور اس کے گلے میں ملکہ وکٹوریہ کے روپوں کی مالا بھی پڑی تھی۔ یہ تین گہنے اس کے تینوں مشترکہ شوہروں کی واحد جائداد تھی۔ اس کے دونوں متوفی شوہر مرتے دم تک یاتریوں کا سامان ڈھوتے رہے تھے اور اتفاق سے اکٹھے ہی ایک پہاڑ پر سے گر کر مر گئے تھے جل دھرا بڑے میٹھے لہجے میں بات کرتی تھی اور ہر وقت سویٹر بنتی رہتی تھی۔ اسے کنٹھ مالا کا پرانا مرض تھا۔ فقیرا اس کے علاج معالجے کے لئے فکرمند رہتا تھا اور اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔

یہ پہاڑیوں کے ہاں کیسا بہ اِرواج ہے ایک لگائی کے دو دو تین تین خاوند ـــــــ

اور جل دھرا کا تذکرہ دوپہر کو کھانے کی میز پر ہوا تھا۔ تو باجی نے فوراً دروپدی کا حوالہ دیا تھا۔

اور کہا تھا کہ پہاڑیوں میں پولی اینڈری کا رواج مہا بھارت کے زمانے سے چلا آتا ہے اور ملک کے بہت سے حصوں کا سماجی ارتقاء ایک خاص اسٹیج پر پہنچ کر وہیں منجمد ہو چکا ہے اور پہاڑی علاقے بھی ان ہی پسماندہ حصوں میں سے ہیں۔ باجی نے یہ بھی کہا کہ پولی اینڈری جسے اردو میں چند سو ہری کہتے ہیں اور مادرانہ نظام کی یادگار ہے اور معاشرے نے جب مادرانہ نظام سے پدری نظام کی طرف ترقی کی تو انسان بھی کنبیر الازدواجی کی طرف چلا گیا اور مادرانہ نظام سے بھی پہلے ہزاروں سال قبل تین چار بھائیوں کے بسجائے قبیلوں کے پورے پورے گروہ ایک ہی عورت کے ساتھ رہتے تھے اور ویدوں میں ان قبائل کا ذکر موجود ہے۔ میں منہ کھولے یہ سب سنتی رہی باجی بہت سخت قابل تھیں بی اے میں انہیں فرسٹ ڈویژن ملا تھا اور ساری علی گڑھ یونیورسٹی میں اول رہی تھیں۔

ایک روز میں اپنی چھوٹی سی سائیکل پر اپنی سہیلیوں کے وہاں جا رہی تھی۔ ریشم میرے پیچھے پیچھے بھاگتی آ رہی تھی۔ اس خیال سے کہ وہ سڑک پر آنے والی موٹروں سے کچل نہ جائے۔ میں سائیکل سے اتری اسے خوب ڈانٹ کر سڑک پر سے اٹھا لیا اور باڑ پر سے احاطے کے اندر پھینک دیا اور پیڈل پر زور سے پاؤں مار کر آگے نکل گئی۔

لیکن ریشم احاطے میں کودنے کی بجائے۔ باڑ کے اندر لگے ہوئے تیز نوکیلے کانٹوں والوں تاروں میں الجھ گئی اور اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا اور اسی طرح تاروں سے لٹکتی اور کراہتی رہی بہت دیر بعد جب فقیرا ادھر سے گزرا جو جھاڑیوں سے مرچیں اور ٹماٹر توڑنے اس طرف آیا تھا۔ تو اس نے بڑی مشکل سے ریشم کو باڑ میں سے نکالا اور اندر لے گیا۔

جب میں کملا اور وملا کے گھر سے لوٹی تو دیکھا کہ سب کے چہرے اترے ہوئے ہیں۔

تمہاری ریشم مر رہی ہے۔ باجی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کم بخت جانے کس طرح جا کر باڑ کے تاروں میں الجھ گئی۔ جنے اس طرح احمق کیوں ہے۔ چڑیوں کی لالچ میں وہاں جا گھسی ہو گی۔ اب بری طرح چلا رہی ہے۔ ابھی ڈاکٹر صاحب مرہم پٹی کر کے گئے ہیں،،

میرا دل دہل گیا۔ ریشم کی اس ناقابلِ برداشت تکلیف کی ذمہ دار میں تھی۔ اس کی تکلیف اور ممکن موت کے صدمے کے ساتھ انتہائی شدید احساسِ جرم نے مجھے سراسیمہ کر دیا اور میں جا کر

گھر کے پچھواڑے گھنے درختوں میں چھُپ گئی تاکہ دُنیا کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں۔ کچھ فاصلے پر کھٹ کھٹ بڑھیا کی شکل والی مسز وآربروک کے گھر میں سے وائرلیس کی آواز آ رہی تھی۔ دور شاگرد پیشے کے سامنے فقیرا کی بھاوج گھاس پر بیٹھی غفور بیگم سے بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ پچھلے برآمدے میں باجی اب مظفر بھائی کو خط لکھنے میں محو ہو چکی تھیں۔ باجی کی عادت تھی کہ دن بھر میں کوئی بھی خاص بات ہوتی تھی تو وہ فوراً مظفر بھائی کو طویل سا خط لکھتی تھیں۔ ریشم پٹیوں سے بندھی ان کے نزدیک اپنی ٹوکری میں پڑی تھی۔ ساری دُنیا پُرسکون تھی۔ صرف میں ایک روپوش مجرم کی طرح اُونچی اُونچی گھاس میں کھڑی سوچتی رہی تھی کہ اب کیا کروں۔ آخر میں آہستہ آہستہ اپنے والد کے کمرے کی طرف گئی اور دریچے میں سے اندر جھانکا۔ والد آرام کرسی پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے میں اندر گئی اور کرسی کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔ "کیا بات ہے بی بی؟" میری سسکی کی آواز پر انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"ریشم کو۔ ریشم کو ہم نے باڑ میں پھینک دیا تھا۔"

"آپ نے پھینک دیا تھا؟"

"ہم ــــ ہم کملا و تلا کے ہاں جانے کی جلدی میں تھے۔ وہ اتنا منع کرنے کے باوجود پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ ہم نے اسے جلدی سے باغ کے اندر پھینک دیا۔" اتنا کہہ کر میں نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

رونے کے بعد دل ہلکا ہوا اور حرم کا تھوڑا سا پرائشچت بھی ہو گیا مگر ریشم کی تکلیف کسی طرح کم نہ ہوئی۔ شام کو سائمن سبق سکھانے کے بعد دیر تک اس کے پاس بیٹھے اس سے باتیں کرتے رہے۔

ریشم کی روزانہ مرہم پٹی ہوتی تھی اور ہفتے میں ایک دفعہ اسے "گھوڑا ہسپتال" بھیجا جاتا تھا۔ اس کی ران پر سے اس کے گھنے اور لمبے لمبے سرمئی بال مونڈ دیئے گئے تھے اور زخم کی گہری سرخ لکیریں دور تک کھنچی ہوئی تھیں۔ کافی دنوں کے بعد اس کے زخم بھرے اور اس نے لنگڑا کر چلنا شروع کر دیا۔ ایک مہینے بعد وہ آہستہ آہستہ لنگڑاتی ہوئی سائمن کو پہنچانے پھاٹک تک گئی اور جب فقیرا بازار سے اس کے لئے پھچھڑے لے کر آتا تو وہ اسی طرح

لنگڑاتی ہوئی کونے میں رکھے ہوئے اپنے برتن تک بھی جانے لگی۔

ایک روز صبح کے وقت مسٹر جارج بیکٹ باڑ پر نمودار ہوتے اور ذرا جھجکتے ہوئے انہوں نے مجھے اپنی طرف بلایا۔

"ریشم کی طبیعت اب کیسی ہے؟" انہوں نے دریافت کیا "مجھے مسٹر سائمن نے بتایا تھا۔ کہ وہ بہت زخمی ہوگئی تھی۔"

مسٹر جارج بیکٹ نے پہلی بار اس محلّے میں کسی سے بات کی تھی۔ میں نے ریشم کی خیریت دریافت کرنے کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا اور وہ اپنے چارخانہ کوٹ کی پھٹی ہوئی جیبوں میں انگوٹھے ٹھونس کر آگے چلے گئے۔

مسٹر جارج بیکٹ ایک بے حد فاقہ زدہ اینگلو انڈین تھے وہ پلپلی صاحب کہلاتے تھے۔ وہ سڑک کے سرے پر ایک خستہ حال کائی آلود کاٹج میں رہتے تھے اور بالٹی اُٹھا کر صبح کو میونسپلٹی کے نل پر خود پانی بھرنے جایا کرتے تھے۔ ان کی ایک لڑکی تھی جس کا نام ڈائنا تھا وہ پریڈ گراؤنڈ پر ایک انگریزی سینما ہال میں ٹکٹ بیچتی تھی اور خوش رنگ فراک پہنے اکثر سامنے سے سائیکل پر گزرا کرتی تھی، اس کے پاس صرف چار فراک تھے جنہیں وہ دھو دھو کر اور بدل بدل کر پہنا کرتی تھی اور مسز گوسوامی، مسز فاروقی اور مسز جسونت سنگھ کا کہنا تھا کہ "سینما ہال کی نوکری سے اسے صرف پچیس روپلی ملتے ہیں اور کیسے ٹھاٹھ کے کپڑے پہنتی ہے اسے گورے پیسے دیتے ہیں"، لیکن گورے اگر اسے پیسے دیتے تھے (یہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے گورے کیوں پیسے دیتے تھے) تو اس کا بوڑھا باپ نل پر پانی بھرنے کیوں جاتا تھا۔

یہ پنشن یافتہ متموّل انگریزوں کا محلّہ تھا جو پُر فضا خوبصورت کوٹھیوں میں خاموشی سے رہتے تھے، ان کے انتہائی نفاست سے سجے ہوئے کمروں اور برآمدوں میں لندن السٹریٹڈ نیوز، ٹیٹلر، کنٹری لائف اور پنچ کے انبار میزوں پر رکھے تھے اور ٹائمز اور ڈیلی ٹیلی گراف کے پلندے سمندری ڈاک سے ان کے نام آتے تھے۔ ان کی بیویاں روزانہ صبح کو اپنے اپنے "مورننگ روم" میں بیٹھ کر بڑے اہتمام سے "ہوم" خط لکھتی تھیں اور ان کے "گول کمروں" میں ان کے بیٹوں کی تصویریں روپہلے فریموں میں سجی تھیں۔ جو مشرقی افریقہ اور جنوب مشرقی ایشیا میں سلطنت

برطانیہ کے آفتاب کو مزید چمکانے میں مصروف تھے۔ یہ لوگ مدتوں سے اس ملک میں رہتے آ رہے تھے مگر "کوئی ہائے" اور "عبدل۔ چھوٹا حاضری مانگتا" سے زیادہ الفاظ نہ جانتے تھے۔ یہ عزلت پسند انگریز دن بھر باغبانی یا برڈ واچنگ (BIRD WATCHING) یا ٹکٹ جمع کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ یہ بڑے عجیب لوگ تھے۔ مسٹر ہارڈ کاسل تبتی زبان اور رسم و رواج کے ماہر تھے۔ مسٹر گرین آسام کے کھاسی قبائل پر اتھارٹی تھے۔ کرنل وائٹ ہیڈ جو شمالی مغربی سرحد کے معرکوں میں اپنی ایک ٹانگ کھو چکے تھے اور لکڑی کی ٹانگ لگاتے تھے، خوشحال خاں خٹک پر عبور رکھتے تھے۔ میجر شیلٹن اسٹیٹس مین میں شکار کے متعلق مضامین لکھا کرتے تھے اور مسٹر مارچ بین کو شطرنج کا خبط تھا۔ مس ڈنک وائٹ پلانچٹ پر روحیں بلاتی تھیں اور مسز وار بروک تصویریں بناتی تھیں۔

مسز وار بروک ایک بریگیڈیر کی بیوہ تھیں اور ہمارے پچھواڑے رہتی تھیں۔ ان کی بوڑھی پھونس کنواری بہن بھی ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان دونوں بہنوں کی شکلیں لمبی چونچ والے پرندوں کی ایسی تھیں اور یہ دونوں اپنے طویل و عریض ڈرائنگ روم کے کسی کونے میں بیٹھی آبی رنگوں سے ہلکی پھلکی تصویریں بنایا کرتی تھیں۔ وہ دونوں اتنی مختصر سی تھیں کہ پھول دار غلافوں سے ڈھکے ہوئے فرنیچر اور دوسرے ساز و سامان کے جنگل میں کھو جاتی تھیں اور پہلی نظر میں بڑی مشکل سے نظر آتی تھیں۔

ڈالن والا کی ایک کوٹھی میں "انگلش اسٹورز" تھا جس کا مالک ایک پارسی تھا۔ محلے کی ساری انگریز اور نیٹو بیویاں یہاں آ کر خریداری کرتی تھیں اور اسکنڈل اور خبروں کا ایک دوسرے سے تبادلہ کرتی تھیں۔

اس خوش حال اور مطمئن انگریزی محلے کے واحد مفلس اور اینگلو انڈین باسی کبھی کبھی نیلی آنکھوں والے مسٹر جارج بیکٹ تھے مگر وہ بڑی آن بان والے اینگلو انڈین تھے اور خود کو پکا انگریز سمجھتے تھے۔ انگلستان کو "ہوم" کہتے تھے اور چند سال اُدھر جب شہنشاہ جارج پنجم کے انتقال پر کولاگڑھ میں سلو مارچ پر بڑی بھاری پریڈ ہوئی تھی اور گوروں کے بینڈ نے موت کا نغمہ بجایا تھا تو مسٹر جارج بیکٹ بھی بازو پر سیاہ ماتمی پٹی باندھ کر کولاگڑھ گئے تھے اور انگریزوں کے مجمع میں بیٹھے تھے اور ان کی لڑکی ڈائنا روز نے اپنے سنہرے بالوں اور خوبصورت چہرے

کو سیاہ ہیٹ اور سیاہ جالی سے چھپایا تھا اور مسٹر بیکٹ بہت دنوں تک سیاہ ماتمی پٹی یا زو پر باندھے رہے تھے۔

لیکن بچے بہت بے رحم ہوتے ہیں۔ ڈالن والا کے سارے ہندوستانی بچے مسٹر جالبج بیکٹ کو نہ صرف پبلی صاحب کہتے تھے بلکہ کملا اور ولا کے بڑے بھائی سورن نے جو ایک پندرہ سالہ لڑکا تھا اور ڈوون پبلک اسکول میں پڑھتا تھا مسٹر بیکٹ کی لڑکی ڈائنا کو چڑانے کی ایک اور ترکیب نکالی تھی۔

کملا اور ولا کے والد ایک بے حد دلچسپ اور خوش مزاج انسان تھے۔ انہوں نے ایک بہت ہی انوکھا انگریزی ریکارڈ ۱۹۲۸ء میں انگلستان سے خریدا تھا۔ یہ ایک انتہائی بے تکا گیت تھا۔ جس کا اینگلو انڈین اردو میں ترجمہ بھی ساتھ ساتھ اسی دھن میں گایا گیا تھا۔ نہ جانے کس منچلے انگریز نے اسے تصنیف کیا تھا۔ یہ ریکارڈ اب سورن کے قبضے میں تھا اور جب ڈائنا سائیکل پر ان کے گھر کے سامنے سے گزرتی تو سورن گراموفون دریچے میں رکھ کر اس کے بھونپو کا رُخ سڑک کی طرف کر دیتا اور سوئی ریکارڈ پر رکھ کر چھپ جاتا۔

مندرجہ ذیل بلند پایہ روح پرور گیت کی آواز بلند ہوتی ——

There was a rich merchant in London did stay
Who had for his daughter an uncommon liking,
Her name it was Diana, she was sixteen years old,
And had a large fortune in silver and gold.

ایک بار ایک سوداگر شہر لندن میں تھا۔
جس کی ایک بیٹی نام ڈائنا اُس کا۔
نام اس کا ڈائنا سولے برش کا عمر
جس کے پاس بہت کپڑا چاندی اور سونا

As Diana was walking in the garden one day.
Her father came to her and thus did he say:
Go dress yourself up in gorgeous atray.
For you will have a husband both gallant
and gay.

ایک دن جب ڈائنا باغیچہ میں تھی
باپ آیا اور بولا بیٹی
جاؤ کپڑا پہنو اور ہو صفا
کیونکہ میں تیرے واسطے ایک خاوند لایا

O father, dear father I've made up my mind,
To marry at present I don't feel inclined.
And all my large fortune every day adore,
If you let live me single a year or two more.

ارے رے مورا باپ تب بولی بیٹی
شادی کا ارادہ میں نہیں کرتی
اگر ایک دو برس تکلیف نا ہیں دیو
آ آ ارے دولت میں بالکل چھوڑ دیوں

Then gave the father a gallant reply:
If you don't be this young man's bride,
I'll leave all your fortune to the fearest of things
And you shan't reap the benefit of a single thing.

تب باپ بولا ارے بچہ بیٹی
اس شخص کی جو رو تو نا ہیں ہوتی
مال اور اسباب تیرا کٹھا کر دیوں
اور ایک کچی دمڑی بھی تجھے نا دیوں

As Wilikins was walking in the garden one day,
He found his dear Diana lying dead on the way.
A cup so fearful that lay by her side,
And Wilikins doth fainteth with a cry in his eye.

ایک دن جب ولی کن ہوا کھانے کو گیا
ڈائنا کا مُردہ ایک کونے میں پایا۔
ایک بادشاہ پیالہ اس کے کمر پہ پڑا
اور ایک چٹھی جس میں لکھا:۔

"زہر پی کے مرا"

جیسے ہی ریکارڈ بجنا شروع ہوتا، بے چاری ڈائنا سائیکل کی رفتار تیز کر دیتی اور اپنے سنہرے بال جھٹک کر زناٹے سے آگے نکل جاتی۔

اس موسم کا دوسرا اہم واقعہ پریڈ گراؤنڈز میں "دی گریٹ ایسٹ انڈین سرکس اینڈ کارنیول" کی آمد تھا۔ اس کے اشتہار لنگوروں اور مسخروں کے بلے جلوس کے ذریعے بانٹے گئے تھے۔ جن پر لکھا تھا:۔

بیسویں صدی کا حیرت ناک تماشہ
شیر دل حسینہ
مس زہرہ ڈر۔لی
موت کے کنویں میں
آج شب کو

سب سے پہلے فقیر اس کس دیکھ کر لوٹا۔ وہ اپنی بھاوج کو بھی کھیل دکھانے لے گیا تھا اور صبح

کو اس نے اطلاع دی ——" بیگم صاحب —— بڑی بیٹا —— بی بی —— زنانی ڈیتھ آف ویل ہیں ایسے پھٹ پھٹی چلاتی ہے کہ بس کیا بتاؤں —— عورت ہے کہ شیر کی بچی —— ہرے رام —— ہرے رام ——"

دوسرے دن اسکول میں کملا دملا نے مجھے بتایا کہ مس زہرہ ڈربی ایک نہایت سنسنی خیز خاتون ہے اور وہ دونوں بھی اس کے دلیرانہ کمالات بچشم خود دیکھ کر آئی ہیں۔

چونکہ میں سرکس پہ پہلے ہی سے عاشق تھی لہذا جلد از جلد باجی کے ساتھ پریڈ گراؤنڈ پہنچی۔ وہاں نمبو کے باہر ایک اونچے چوبی پلیٹ فارم پہ ایک موٹر سائیکل گھرگھرا رہی تھی اور اس کے پاس مس زہرہ ڈربی کرسی پر فروکش تھی۔ اس نے نیلے رنگ کی چمک دار ساٹن کا اس قطع کا لباس پہن رکھا تھا جو مس نادیا نے ہنٹر والی فلم میں پہنا تھا۔ اس نے چہرے پر بہت سا گلابی پاوڈر لگا رکھا تھا جو بجلی کی روشنی میں نیلا معلوم ہو رہا تھا اور ہونٹ خوب گہرے سُرخ رنگے ہوئے تھے۔ اس کے برابر میں ایک بے حد خوفناک بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی اسی طرح کی زنگ برنگی "برجیس" پہنے، لمبے لمبے پٹے سجائے اور گلے میں بڑا سا سُرخ رومال باندھے بیٹھا تھا۔ مس زہرہ ڈربی کے چہرے پر بڑی اکتاہٹ تھی۔ اور وہ بڑی بے لطفی سے سگریٹ کے کش لگا رہی تھی۔

اس کے بعد دونوں موت کے کنویں میں داخل ہوئے جس کی تہہ میں ایک اور موٹر سائیکل رکھی تھی۔ خوفناک آدمی موٹر سائیکل پہ چڑھا اور مس زہرہ ڈربی سامنے اس کی باہوں میں بیٹھ گئی اور خوفناک آدمی نے کنویں کے چکر لگائے۔ پھر وہ اتر گیا اور مس زہرہ ڈربی نے تالیوں کے شور میں موٹر سائیکل پہ تنہا کنویں کے چکر لگائے اور اوپر آکر دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے اور موٹر سائیکل کی تیز رفتاری کی وجہ سے موت کا کنواں زور زور سے ہلنے لگا اور میں مس زہرہ ڈربی کی اس حیرت انگیز بہادری کو مسحور ہو کر دیکھتی رہی۔ کھیل کے بعد وہ دوبارہ اسی طرح چبوترے پر جا بیٹھی اور بے تعلقی سے سگریٹ پینا شروع کر دیا۔ گویا کوئی بات ہی نہیں۔

یہ واقعہ تھا کہ مس زہرہ ڈربی جاپانی چھتری سنبھال کر تار پہ چلنے والی میموں اور شیر کے پنجرے میں جانے والی اور اونچے اونچے تاروں اور جھولوں پہ کمالات دکھانے والی لڑکیوں سے بھی زیادہ بہادر تھی۔ پچھلے برس وہاں "عظیم الشان آل انڈیا دنگل" آیا تھا جس میں مس حمیدہ بانو

پہلوان نے اعلان کیا تھا کہ جو مرد پہلوان انہیں ہرا دے گا وہ اس سے شادی کر لیں گی لیکن بقول فقیرا کوئی مائی کا لال اس شیر کی بچی کو نہ ہرا سکا تھا اور اسی دنگل میں پروفیسر تارا بائی نے بھی بڑی زبردست کشتی لڑی تھی اور ان دونوں پہلوان خواتین کی تصویریں اشتہاروں پر چھپی تھیں جن میں وہ بنیان اور نیکریں پہنے ڈھیروں تمغے لگائے بڑی شان وشوکت سے کیمرے کو گھور رہی تھیں۔

یہ کون پراسرار ہستیاں ہوتی ہیں جو تار پر چلتی ہیں اور موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاتی ہیں اور اکھاڑے میں کشتی لڑتی ہیں۔ میں نے سب سے پوچھا لیکن کسی کو بھی ان کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔

"دی گریٹ ایسٹ انڈین سرکس" ابھی تماشے ہی دکھا رہا تھا کہ ایک روز فقیرا پلٹن بازار سے سودا لے کر لوٹا تو اس نے ایک بڑی تہلکہ خیز خبر سنائی کہ مس زہرہ ڈربی کے عشاق ماسٹر گلقند اور ماسٹر چھچھوندر کے درمیان چکو چل گیا۔ ماسٹر چھچھوندر نے مس زہرہ ڈربی کو بھی چکو سے گھائل کر دیا اور وہ ہسپتال میں پڑی ہیں اور اس سے بھی تہلکہ خیز خبر، جو فقیرا نے چند دن بعد میونسپلٹی کے نل پر سنی، یہ تھی کہ پلپلی صاحب کی مسیا نے سرکس میں نوکری کر لی۔

"ڈائنا بیکٹ نے ——؟" باجی نے دہرایا۔

"جی ہاں بڑی بیٹیا —— پلپلی صاحب کی مسیا سنا ہے کہتی ہے کہ اس سے اپنے باپ کی گریبی اور تکلیف اب نہیں دیکھی جاتی اور دنیا والے تو یوں بھی تنگ کرتے ہیں اوڈین سینما میں اسے پچیس روپے ملتے تھے سرکس میں پچھتر روپے ملیں گے —— یہ تو سچ ہے۔ وہ گریب تو بہت تھی بڑی بٹیا ——"

"اور گورے جو اس کو پیسے دیتے تھے؟" میں نے پوچھا۔

غفور بیگم نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا۔ "جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ یہاں سے۔" لہٰذا میں بھاگ گئی اور باہر جا کر ریشم کی ٹوکری کے پاس بیٹھ کے ڈائنا بیکٹ کی بہادری کے متعلق غور کرنے لگی۔

اب کی بار جب لنگوروں اور مسخروں نے سرکس کے اشتہار بانٹے تو ان پر چھپا تھا——

سرکس کے عاشقوں کو مژدہ
پری جمال یورپین دوشیزہ کے حیرت انگیز کمالات
فتالۂ عالم، حسینۂ لندن
مس ڈائنا روز
موت کے کنویں میں
آج شبکو

ان ہی دنوں سینما کا چرچا ہوا یوں تو سینما کے اشتہار عرصے سے کلڈی کے ٹھیلوں پر چپکے سامنے سے گزرا کرتے تھے:

سال رواں کا بہترین فلم
"چیلنج"
جس میں مس سردار اختر کام کرتی ہیں پریڈ کے سامنے
پلیڈیم سینما میں — آج شبکو

اور

سال رواں کا بہترین فلم
"دہلی ایکسپریس"
جس میں مس سردار اختر کام کرتی ہیں
پریڈ کے سامنے راکسی سینما میں
آج شبکو

اور مجھے بڑی پریشانی ہوتی تھی کہ مس سرداراختر دونوں جگہوں پر بیک وقت کس طرح "کام" کریں گی۔ لیکن قسمت نے ایک دم پول پلٹا کھایا کہ باجی اور ان کی سہیلیوں کے ساتھ یکے بعد دیگرے تین فلم دیکھنے کو ملے ——— "اچھوت کنیا"، جس کے لئے مسز جوگ مایا چیڑجی نے بتایا کہ ہمارے دیش میں بہت زبردست سماجی انقلاب آگیا ہے اور گرودیو ٹیگور کی بھانجی دیویکا رانی اب فلموں میں کام کرتی ہیں اور "جیون لتا" جس میں ستیا دیوی نازک نازک چھوٹی سی آواز میں گاتیں ——— "موہے پریم کے جھولے جھلا دے کوئی ———"، اور "جیون پربھات"، جسے باجی بڑے ذوق وشوق سے اس لئے دیکھنے گئیں کہ اس میں خورشید آپا "کام" کر رہی تھیں، جو اب رینوکا دیوی کہلاتی تھیں، جو اس زبردست سماجی انقلاب کا ثبوت تھا، مسز جوگ مایا چیڑجی کی بشارت کے مطابق ہندوستان جس کے دروازے پر کھڑا تھا اور تبھی مسز جوگ مایا چیڑجی کی لڑکیوں نے ہارمونیم پر فلمی گانے "زبانی"، شروع کر دیئے "بانکے بہاری بھول نہ جانا ——— پنیم پیاری پریت نبھانا ———" اور "چور چُراوے مال خزانہ، پیانینوں کی نندیا چراوے"، اور ——— "تم اور میں اور مُنّا پیارا۔ گھر وہ ہوگا سورگ ہمارا ———"

عفور بیگم کام کرتے کرتے ان آوازوں پر کان دھرنے کے بعد کمر پر ہاتھ رکھ کر کہتیں ——— "بڑے بوڑھے سچ کہہ گئے تھے۔ قربِ قیامت کے آثار یہی ہیں کہ گاتے بینگنیاں کھائے گی اور کنواریاں اپنے منہ سے بر مانگیں گی۔"

اتنے میں منور ما چیڑ جی کی سریلی آواز بلند ہوتی ——— "موہے پریم کے جھولے جھلا دے کوئی"

"بے حیائی تیرا آسرا ———" عفور بیگم کانپ کر فریاد کرتیں اور سلیپر پاؤں میں ڈال پٹر پٹر کرتی اپنے کام کاج میں مصروف ہو جاتیں۔

ان ہی دنوں فقیرا بھی اپنی بھاوج کو یہ ساری فلمیں سیکنڈ شو میں دکھا لایا۔ مگر جس رات چل دھرا "چنڈی داس"، فلم دیکھ کر لوٹی تو اسے بڑا سخت بخار چڑھ گیا اور ڈاکٹر ہُون نے صبح کو آکر اسے دیکھا اور کہا کہ اس کا مرض تشویشناک صورت اختیار کر چکا ہے اب وہ روز تانگے میں بیٹھ کر ہسپتال جاتی اور واپس آکر دھوپ میں گھاس پر کمبل بچھا کر لیٹی رہتی۔

کچھ دنوں میں اس کی حالت ذرا بہتر ہوگئی اور سکھ نندن خانساماں کی بیوی دھن کلیا اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھ کر اس کا دل بہلانے کے لئے پوربی گیت گایا کرتی اور اسے چھیڑ چھیڑ کر الاپتی ——

"ناجوادا سے سرم و حیا سے
بالے سیّاں سے سرمائے گئی ہیں تو ——"

اور غفور بیگم جب جل دھرا کی خیریت پوچھنے جاتیں تو وہ مسکرا کر کہتی —— "انّا جی —— میرا تو سمے آگیا۔ اب تھوڑے دن میں پران نکل جائیں گے ——"

اور غفور بیگم اس کا دل رکھنے کے لئے کہتیں "اری تو ابھی بہت جیئے گی —— اور اے جل دھرا —— ذرا یہ تو بتا کہ تو نے فقیر انگوڑے پر کیا جادو کر رکھا ہے —— ذرا مجھے بھی وہ منتر بتا دے مجھ بنختی کو تو اپنے گھر والے کو رام کرنے کا ایک بھی نسخہ نہ ملا —— تو ہی کوئی ٹوٹکا بتا دے۔ سنا ہے پہاڑوں پر جادو ٹونے بہت ہوتے ہیں —— فقیر ابھی کیسا تیرا کلمہ پڑھتا ہے —— اری تُو تو اس کے ماں کے برابر ہے —— !" اور وہ بڑی ادا سے ہنس کر جواب دیتی ——

"انّا جی۔ کیا تم نے سنا نہیں پرانے چاول کیسے ہوتے ہیں ؟"

"پرانے چاول —— ؟" میں دہراتی اور غفور بیگم ذرا گھبرا کر مجھے دیکھتیں اور جلدی سے کہتیں —— "بی بی آپ یہاں کیا کر رہی ہیں ؟ جائیے بڑی بٹیا آپ کو بلا رہی ہیں ——"

لہٰذا میں سر جھکائے نئے بجری کی رنگ برنگی کنکریاں جوتوں کی نوک سے ٹھکراتی باجی کی طرف چلی جاتی۔ مگر وہ فلسفے کی موٹی سی کتاب کے مطالعہ میں یا مظفر بھائی کا خط پڑھنے یا اس کا جواب لکھنے میں مستغرق ہوتیں اور مجھے کہیں اور جانے کا حکم دے دیتیں تو میں گھوم پھر کر دوبارہ ریشم کی ٹوکری کے پاس جا بیٹھتی اور اس کے جلد تندرست ہونے کی دعائیں مانگنے لگتی۔

اسکول میں کرسمس کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں، میں صبح صبح کملا و ملا کے گھر جا رہی تھی کہ راستے میں مسٹر بیکٹ نظر آئے۔ وہ بے حد حواس باختہ اور دیوانہ وار ایک طرف کو بھاگے چلے جا رہے تھے۔ اتنے میں میجر شیلٹن نے اپنی ۱۹۲۶ء ماڈل کی کھڑکھڑیا فورڈ روک کر انہیں اس میں بٹھا لیا اور فوراً ڈیوربین ہسپتال کی سمت روانہ ہوگئے۔

میں کملا کے گھر پہنچی تو سوورن خلاف معمول بہت خاموش تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے

بتایا کہ وہ ابھی پیریڈ گراونڈز سے سارا واقعہ سن کر آرہا ہے ——

ڈانا بیکٹ ابھی ماسٹر مچھندر کے ساتھ ہی موٹر سائیکل پہ بیٹھی تھی اور دیکھنے والوں کا بیان تھا کہ دہشت کے مارے اس کا رنگ سفید پڑ جاتا تھا اور وہ آنکھیں بند کئے رہتی تھی۔ مگر سرکس مینیجر نے اصرار کیا کہ وہ تنہا موٹر سائیکل چلانے کی ٹریننگ بھی شروع کر دے تاکہ اس کے دل کا خوف نکل جائے۔ دل کا خوف نکالنے کے لئے اس نے موٹر سائیکل پہ تنہا بیٹھ کر کنویں کی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی مگر موٹر سائیکل بے قابو ہو گئی اور ڈانا کی دونوں ٹانگیں موٹر سائیکل کے تیزی سے گھومتے ہوئے پہیوں میں آکر چور چور ہو گئیں۔ اسے فوراً یورپین ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ کرنل وائی کومب سول سرجن نے کہا ہے کہ "اس کی دونوں ٹانگیں ہمیشہ کے لئے بے کار ہو گئی ہیں اور اسے ساری عمر پہیوں والی کرسی پہ بیٹھ کر گزارنی ہو گی"

اس دن ہم لوگوں کا کسی چیز میں دل نہ لگا اور ہم سب ایک درخت کی شاخ پہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد دفعتاً سورن شاخ پر سے نیچے کودا، اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کرکٹ کھیلنے چلا گیا اور میں نے دیکھا کہ سب کے چہرے پہ ایک عجیب سی ندامت طاری تھی۔ ایک انجانا سا احساس جرم اور ندامت ——

دوسرے روز دی گریٹ ایسٹ انڈین سرکس اینڈ کارنیول کے نوکیلی مونچھوں اور بے شمار تمغوں والے مینیجر اور رنگ ماسٹر پروفیسر شہباز نے اعلان کیا کہ سرکس کوچ کر رہا ہے اور آئندہ سال معزز شائقین کو اس سے زیادہ حیرت ناک تماشے دکھائے جائیں گے لیکن فقیرا کی اطلاع کے مطابق وہ ڈرا ہوا تھا۔ اس کے سرکس میں پے در پے دو شدید حادثے ہوتے تھے اور پولس اس کے پیچھے لگ گئی تھی۔

سرکس نے کوچ کر دیا اور مس زہرہ ڈربی بھی سول ہسپتال سے جانے کہاں غائب ہو گئی۔

کرسمس کی چھٹیاں شروع ہوتے ایک ہفتہ گزرا تھا کہ ایک بہت لمبی اور موٹی تلی بی بی ہمارے یہاں مہمان آئیں۔ ان کا نام ڈاکٹر زبیدہ صدیقی تھا۔ وہ دہلی سے کلکتے جا رہی تھیں اور ایک ہفتے کے لئے ہمارے یہاں ٹھہری تھیں۔ انہوں نے ولایت سے سائنس کے کسی مضمون میں پی۔ ایچ۔ ڈی

کیا تھا۔ وہ کسی دور افتادہ دیسی ریاست کے گرلز کالج کی پرنسپل تھیں اور سیاہ کنارے کی سفید ساری اور لمبی آستینوں کا سفید بلاؤز پہنتی تھیں، وہ اپنی طویل القامتی کی وجہ سے ذرا جھک کر چلتی تھیں اور سنہوڑا کہ بڑی گہری نظر سے ہر ایک کو دیکھتی تھیں۔ اس وقت وہ گنتی کی ان مسلمان خواتین میں سے تھیں جنہوں نے سمندر پار جاکر اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔

پہلے روز جب وہ کھانا کھانے بیٹھیں تو انہوں نے ذرا جھجک کر کہا "آپ کے ہاں سارے ملازم ہندو ہیں۔ میں دراصل ہندو کے ہاتھ کا پکا نہیں کھاتی ——"

"مسلمان ہو کر آپ چھوت چھات کرتی ہیں زبیدہ آپا؟ کمال ہے، اور آپ تو ولایت تک ہو آئی ہیں زبیدہ آپا ——" باجی نے اپنی خوبصورت آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"دراصل —— وہ —— میں —— میں ایک وظیفہ پڑھ رہی ہوں آج کل" —— انہوں نے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔ لہٰذا ان کا کھانا غفور بیگم نے باوضو ہو کر اپنے ہاتھ سے تیار کرنا شروع کیا۔

پڑوس کی مسلمان بیبیوں پر ڈاکٹر صدیقی کی مذہبیت کا بے انتہا رعب پڑا۔ "لڑکی ہو تو ایسی، سات سمندر پار ہو آئی۔ مگر ساری کا آنچل مجال ہے جو سر سے سرک جائے ——" مسز فاروقی نے کہا۔

"شرعی پردہ تو دراصل یہی ہے، کہ عورت بس اپنا چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھے اور اپنی زینت مردوں سے چھپائے۔ قرآن پاک میں یہی آیا ہے" مسز قریشی نے جواب دیا۔

"روزے نماز کی پابند، شرم و حیا کی پتلی اور مومنہ ایسی کہ ہندو کے ہاتھ کا پانی نہیں پیتی ——" مسز انصاری نے تعریف کی۔

ڈاکٹر صدیقی سارے وقت گھاس پر کرسی بچھائے باجی کو جانے کون سی داستان امیر حمزہ سنانے میں مشغول رہتی تھیں اور فقیرا کی بھاوج کو دیکھ کر انہوں نے کہا تھا "کیسی خوش نصیب عورت ہے"

جب ڈاکٹر صدیقی صبح سے شام تک ایک ہی جیسی سنجیدہ اور غمناک شکل بنائے بیٹھی رہتیں تو ان کو محظوظ کرنے کے لئے باجی مجھے بلاتیں (گویا میں کوئی تماشا دکھانے والا بھالو تھی)

اور حکم دیتیں۔ فلاں گیت گاؤ۔ فلاں قصہ سناؤ زبیدہ آپا کو، ذرا بھاگ کے اپنی دوستوں کو بلا لاؤ اور سب مل کر ناچو ——

ایک دن ڈاکٹر صدیقی پچھلے لان پہ بیٹھی باجی سے کہہ رہی تھیں "مرنے کے لئے تو صبر آجاتا ہے، ریحانہ خاتون —— زندہ کے لئے صبر کیسے کروں ——" اور اس دن جب انہوں نے کسی طرح مسکرانے کا نام ہی نہ لیا تو باجی نے مجھے بلا کر حکم دیا —— "ارے رے۔ ذرا وہ اپنے مسخرے پن کا اینگلو انڈین گیت تو سناؤ زبیدہ آپا کو ——"

"بہت اچھا"، میں نے فرمانبرداری سے جواب دیا اور سیدھی کھڑی ہو کر ہاتھ گھٹنوں تک چھوٹو کر (جس طرح اسکول میں انگریزی گانے گاتے یا نظمیں پڑھتے وقت کھڑا ہونا سکھایا گیا تھا) میں نے گیت شروع کیا:

ایک بار ایک سوداگر شہر لندن میں تھا
جس کی ایک بیٹی نام ڈائنا اس کا
نام اس کا ڈائنا سولے برش کا عمر
جس کے پاس بہت کپڑا —— اور —— چاندی —— اور ——

دفعتاً میرے حلق میں کوئی چیز سی آ اٹکی میری آواز رندھ گئی اور میں گیت ادھورا چھوڑ کر وہاں سے تیزی سے بھاگ گئی۔ ڈاکٹر صدیقی حیرت سے مجھے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔

شام کو میں نے دلا سے کہا —— "یہ زبیدہ آپا ہر وقت جتنے اتنی پریشان کیوں نظر آتی ہیں ——"

"مجھے معلوم ہے" دلا نے جواب دیا۔ وہ مجھ سے ذرا بڑی تھی اور ایک ماہر فن ڈیٹیکٹو تھی —— "کل صبح آنٹی فاروقی آنٹی گوسوامی کو انگلش اسٹورز میں بتا رہی تھیں کہ ایک سائنٹسٹ ہیں۔ ان کا نام بھی ڈاکٹر کچھ ہے مجھے یاد نہیں آرہا۔ آنٹی فاروقی نے آنٹی گوسوامی کو بتایا تو تھا —— تو وہ کلکتہ یونیورسٹی میں زبیدہ آپا کے کلاس فیلو تھے اور جب زبیدہ آپا ولایت گئی تھیں تو وہاں مانچسٹر یونیورسٹی میں بھی کئی سال ان کے ساتھ پڑھا تھا —— تو یہ زبیدہ آپا جو

ہیں، تو یہ پچھلے پندرہ برس سے ڈاکٹر کچھو کے نام کی مالا جپ رہی ہیں۔

"یہ کسی کے نام کی مالا کیسے جپتے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہ پتہ نہیں،" دملا نے جواب دیا۔

جب گھر کے اندر آئی تو زبیدہ آپا کو غفور بیگم سے تبادلہ خیالات کرتے پایا۔

اور تبھی یہ پتہ چلا کہ جس ریاست میں زبیدہ آپا کام کرتی ہیں وہ اجمیر شریف کے بہت قریب ہے اور اسی وجہ سے زبیدہ آپا بہت مذہبی ہو گئی ہیں اور جب سے ان کو یہ اطلاع ملی ہے۔ کہ ڈاکٹر محمود خاں خود ان کی یعنی زبیدہ آپا کی سگی بھتیجی سائرہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں جو ایک بے حد خوبصورت سترہ سالہ لڑکی ہے اور کلکتہ کے لورٹو ہاؤس میں پڑھ رہی ہے، تب سے زبیدہ آپا نماز پنجگانہ کے علاوہ چاشت اشراق اور تہجد بھی پڑھنے لگی ہیں اور یہاں وہ غفور بیگم سے پنجسورہ شریف۔ دعائے گنج العرش اور درود تاج کے کتابچے مستعار لے کر پڑھا کرتی تھیں۔ کیونکہ یہ کتابچے سفر پر چلتے وقت وہ گھر بھول آئی تھیں۔ غفور بیگم نے ان سے کہا کہ بٹیا روز رات کو سوتے وقت تسبیح فاطمہؑ پڑھا کیجئے ــــ چنانچہ ایک مرتبہ جب وہ کھانے کے بعد اپنے کمرے میں بیٹھی تسبیح پھیر رہی تھیں تو میں نے، جو جاسوسی پر لگی ہوئی تھی ان کو دیکھ لیا اور صبح کو دملا کو اطلاع دی ــــ

"ہمیں معلوم ہو گیا ــــ کل رات زبیدہ آپا ڈاکٹر کچھو کے نام کی مالا جپ رہی تھیں۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔"

ایک رات دو بجے کے قریب مہمان کمرے سے ایک دل خراش چیخ کی آواز آئی۔ سب لوگ ہڑبڑا کر اپنے اپنے لحافوں سے نکلے اور بھاگتے ہوئے مہمان کمرے کی طرف گئے۔ مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ باجی نے کواڑوں پر زور زور سے دستک دی۔ اندر سے کچھ منٹ بعد زبیدہ آپا نے بڑی کمزور آواز میں کہا ــــ "ٹھیک ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم لوگ خدا کے لئے فکر نہ کرو ــــ جاؤ۔ سو جاؤ ــــ میں بالکل ٹھیک ہوں ــــ سوتے میں ڈر گئی تھی۔"

"زبیدہ آپا ــــ دروازہ کھولئے ــــ" باجی نے چلا کر کہا۔

"چلے جاؤ تم لوگ ــــ ورنہ میں پھر چیخوں گی ــــ" زبیدہ آپا اندر سے ہسٹریائی آواز

ہیں دھاڑیں۔

صبح کو ان کا چہرہ بالکل سُتا ہوا اور سفید تھا۔ ناشتے کے بعد جب کھانے کا کمرہ خالی ہوگیا تو انہوں نے باجی کو آہستہ سے مخاطب کیا ——— "میں نے کسی کو بتایا نہیں تھا ——— میں ایک چلّہ کر رہی تھی۔ انتالیس راتیں پوری ہو چکی تھیں۔ کل چالیسویں اور آخری رات تھی۔ حکم تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، میں اس جلالی وظیفہ کے دوران میں مڑ کر نہ دیکھوں ورنہ اس کا سارا اثر ختم ہو جائے گا اور کل رات ——— دو بجے کے قریب وظیفہ پڑھتے ہیں میں نے اچانک دیکھا کہ جا نماز کے سامنے ایک گدھے کی جسامت کا ہیبت ناک سیاہ کتّا میرے مقابل میں بیٹھا دانت نکوس رہا ہے ——— میں نے دہل کر چیخ ماری اور چلّہ ٹوٹ گیا۔ کتا غائب ہوگیا۔ مگر میرا سارا کیا کرایا اکارت گیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا ———" ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور انہوں نے عینک اتار کر پلکیں خشک کیں۔ باجی ہکا بکا ہو کر انہیں دیکھنے لگیں ——— "مگر زبیدہ آپا ——— آپ تو ——— آپ تو سائنس دان ہیں۔ مانچسٹر یونیورسٹی سے پڑھ کر آئی ہیں اور ایسی توہم پرستی کی باتیں کرتی ہیں۔ ہوش کی دوا کیجئے آپ کو ہیلوسی نیشن (HALLUCINATION) ہوا ہوگا ——— گدھے کے برابر کتّا ——— اور وہ آپ سے آپ غائب بھی ہوگیا ———!" اتنا کہہ کر باجی کھلکھلا کے ہنس پڑیں۔

"ریحانہ خاتون ———" ڈاکٹر صدیقی نے سر ہلا کر باجی کو گہری نظر سے دیکھا اور آہستہ آہستہ کہا "تم ابھی صرف بائیس برس کی ہو۔ تمہارے ماں باپ اور محبت کرنے والے چچاؤں کا سایہ تمہارے سر پہ قائم ہے۔ تم ایک بھرے پُرے کنبے میں، اپنے چہیتے بہن بھائیوں کے ساتھ، سکھ کی چھاؤں میں زندہ ہو۔ اپنی پسند کے نوجوان سے تمہارا بیاہ ہونے والا ہے ——— ساری زندگی تمہاری منتظر ہے۔ دنیا کی ساری مسرّتیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔ خدا نہ کرے تم پہ کبھی ایسی قیامت گزرے جو مجھ پہ گزر رہی ہے۔ خدا نہ کرے کہ تمہیں کبھی تن تنہا اپنی تنہائی کا مقابلہ کرنا پڑے ——— کسی کی بے بسی اور اس کے دکھی دل کا مذاق نہ اڑاؤ ———"

اچانک ان کی نظر مجھ پہ پڑ گئی جو میز کے سرے پہ بیٹھی مستعدی سے جاسوسی میں مصروف تھی۔ کیونکہ گدھے کے برابر سیاہ کتّا ایک انتہائی سنسنی خیز واقعہ تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ خاموش ہوگئیں

باجی نے پلکیں جھپکا کہ مجھے اشارہ کیا کہ میں اڑنچھو ہو جاؤں۔ چنانچہ میں اڑنچھو ہو گئی۔
اس واقعے کے دوسرے دن ڈاکٹر صدیقی کلکتہ روانہ ہو گئیں اور ان کے جانے کے چند روز بعد ہی ایک انوکھی اور بن بلائی مہمان آن اتریں۔

ڈالن والا کی سڑکیں عموماً خاموش پڑی رہتی تھیں۔ اکا دکا راہگیر یا موٹروں اور تانگوں کے علاوہ کبھی کبھار کوئی سکھ جو تشنی ہاتھ میں سرٹیفکیٹوں کا میلا سا پلندہ سنبھالے ادھر ادھر تاکتا سامنے سے گزر جاتا تھا یا موٹے موٹے "چائنامین" زین میں بڑی نفاست سے بندھے ہوئے بے حد وزنی گٹھڑ سائیکلوں پہ لادے چکر کاٹا کرتے تھے یا کشمیری قالین فروش یا بزاز یا قیمتی پتھر فروخت کرنے والا پھیری لگا جاتے تھے۔

مسٹر پیٹر رابرٹ سردار خاں ان ہی پھیری والوں میں سے ایک تھے۔ مگر وہ اپنے آپ کو ٹریولنگ سیلز مین کہتے تھے اور انتہا سے زیادہ چرب زبان اور لسان آدمی تھے۔ موصوف مسلمان سے عیسائی ہو گئے تھے۔ ترکی ٹوپی اوڑھتے تھے اور سائیکل پہ پلاسٹک کے برتن بیچتے گھوما کرتے تھے اور مہینے دو مہینے میں ایک بار ہماری طرف کا پھیرا لگا جاتے تھے وہ اپنی ہر بات کا آغاز "خدا باپ کا نسکہ ہے" سے کرتے تھے اور کبھی کبھی تبلیغ بھی شروع کر دیتے تھے۔

اس دن مسٹر پیٹر رابرٹ سردار خاں جو سائیکل برساتی میں ٹکا کر برآمدے میں داخل ہوتے تو انہوں نے ناک کی سیدھ جا کر مہمان کمرے کے اندر جھانکا جس کا دروازہ کھلا پڑا تھا اور اطمینان سے اظہار خیال کیا ——

"ہوں۔ تو یہ کمرہ تو ہمیشہ خالی ہی پڑا رہتا ہے —— بات یہ ہے کہ میری ایک بہن ہیں۔ وہ لیڈی ڈاکٹر ہیں اور چند روز کے لئے دہرادون آ رہی ہیں" اس کے بعد جواب کا انتظار کئے بغیر وہ سائیکل پہ بیٹھ کر غائب ہو گئے۔

تیسرے روز جاپانی جارجٹ کی ملاگیری ساری میں ملبوس ایک بے حد فربہ خاتون تانگے سے اتریں مسٹر سردار خاں سائیکل پہ ہم رکاب تھے انہوں نے اسباب اتار کر مہمان کمرے میں پہنچایا اور والدہ اور باجی سے ان کا تعارف کرایا —— "یہ میری بہن ہیں۔ آپ کے یہاں دو تین

دن رہیں گی۔ اچھا، اب میں جاتا ہوں۔" پھر خاتون کو مخاطب کیا ۔۔۔ " بھئی تم کو جس چیز کی بھی ضرورت ہو بلا تکلف بیگم صاحبہ سے کہہ دینا ۔۔۔ اپنا ہی گھر سمجھنا اچھا بائی بائی ۔۔۔" اور سائیکل پر بیٹھ یہ جا وہ جا۔

یہ ایک مسلمان بی بی تھیں، جنہوں نے یہ تہ بتایا کہ کہاں سے آرہی ہیں اور کہاں جائیں گی۔ محض اس امر سے انہوں نے آگاہ کیا کہ پرائیویٹ طور پر ہومیو پیتھک ڈاکٹری پڑھ رہی ہیں اور شام کے وقت اپنے اٹیچی کیس میں سے ایک موٹی سی اردو کتاب نکال کر دکھائی جوان کی ہومیو پیتھک ڈاکٹری کا کورس تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ "دی رائل نحتہ ہار مونیم گائیڈ سیریز" کے رسالوں کے ذریعے انہوں نے اس فن میں بھی مہارت تامہ حاصل کر لی ہے اور انہوں نے "اے ماؤ، بہنو، بیٹو، دنیا کی عزت تم سے ہے"، سپاٹ اور بے سُری آوازمیں" باجے"، پر گا کر سنائی۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ وہ آزادی نسواں کی قائل ہیں اور اپنی ماضی سے کنارہ کشی کریں گی ۔۔۔ تیسرے روز مسٹر سردار خاں دوبارہ نمودار ہوئے۔ وہ تانگہ ساتھ لے کر آئے تھے جس میں بٹھا کر ہومیو پیتھک لیڈی ڈاکٹر کو ہمراہ لے گئے۔

مسٹر پیٹر رابرٹ سردار خاں اس کے بعد کبھی نہ آئے۔

دنیا میں بڑے عجیب وغریب واقعات ہوا کرتے تھے۔

ٹیگس ہمارا سیاہ رنگ اور سفید کانوں والا بدشکل اور چھوٹا سا دو غلا کتا تھا۔ وہ دن بھر برساتی کے کونے میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہتا تھا۔ چونکہ وہ نجس تھا، یعنی کتا تھا اس لئے اسے گھر کے اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ جاڑوں میں وہ ایک کوٹھڑی میں پڑے ہوئے اپنے کھٹولے پر سورہتا۔ ریشم کو ہاں نکال کر اس پر غرّاتی تو وہ اس کا بھی برا نہ مانتا۔ وہ بے حد وفادار اور مرنجان مرنج طبیعت کا مالک اور اپنی قسمت پر شاکر وقانع تھا کیونکہ خدا نے اسے ایک نجس کتا ہی پیدا کیا تھا وہ جانتا تھا کہ ریشم کی اس گھر میں بے حد قدر وقیمت ہے اسے اس حقیقت کا بھی علم تھا کہ اس کمینی دنیا میں محض ظاہری رنگ روپ کی قدر کی جاتی ہے ایک ۔۔۔ فلسفی کی مانند آنکھیں بند کئے وہ دن بھر غالباً یہی سب سوچا کرتا تھا اور اجنبی قدموں کی چاپ

سنتے ہی آنکھیں کھول کر فوراً بھونکنا شروع کر دیتا تھا وہ اٹلی اور حبشہ کی جنگ کے زمانے میں میجر شیلٹن کی اصلی انسل کتیا میگی کے یہاں پیدا ہوا تھا، میجر شیلٹن چونکہ بین الاقوامی سیاست سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اس لئے انہوں نے اس کا نام نیگس رکھا تھا۔

جس روز باجی نے اپنی چند سہیلیوں کو چائے پر بلایا تو بجلی کا ایک تار روشنی کے انتظام کے لئے باغ میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس روز موسم بہت خوشگوار تھا اور باجی اور ان کی سہیلیاں غروب آفتاب کے بعد تک اوور کوٹ پہنے یا ہر ٹہلتی رہی تھیں۔ پارٹی کے بعد باجی اپنی مہمانوں کو رخصت کرنے کے لئے ٹہلتی ہوئی سڑک پر چلی گئیں اور نیگس برآمدے میں رکھے ہوئے دعوت کے سامان کی حفاظت کے لئے مستعدی سے سیڑھیوں پہ بیٹھا رہا۔ جب باجی واپس آئیں تو انہوں نے جھک کر دور سے نیگس کو پچکارا۔ نیگس اس خلاف توقع اور غیر معمولی اظہار التفات سے بے انتہا خوش ہوا اور زور زور سے اچھلنے کودنے لگا اور باجی کو مزید خوش کرنے کے لئے اس نے وہ سارے کھیل تماشے دکھانے شروع کئے جو اسے برکت مسیح جمعدار نے سکھلائے تھے۔ اس طرح کھیلتے کھیلتے اس نے پام کے گملوں کے عقب میں پڑا ہوا بجلی کا تار منہ میں اٹھا لیا۔ تار میں کرنٹ موجود تھا۔ لہٰذا نیگس پٹ سے گر گیا اور چند منٹ بعد اس کے منہ سے دھواں نکلا۔ کیوں کہ بجلی نے اسے اندر سے جلا دیا تھا۔

ایک روز ڈاکٹر زبیدہ صدیقی کا خط باجی کے نام کلکتے سے آیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا:

"——— جس روز میں یہاں پہنچی اسی ہفتے میں محمود صاحب نے میری بھتیجی سائرہ سے شادی کر لی بڑی دھوم کی شادی ہوئی ہے تم نے اسٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں دولہا دلہن کی تصویر بھی دیکھی ہوگی۔

پی۔ ایس:۔ میں نے اب اللہ میاں کے خلاف اسٹرائیک کر دیا ہے اور پرسوں میں نے بھی ڈاکٹر اُپل سے سول میرج کر لی۔ ڈاکٹر اُپل بروان کالج میں پڑھاتے ہیں۔

پی۔ پی۔ ایس:۔ ڈاکٹر اُپل ہندو ہیں۔

یہ اطلاع کہ میں نے ایک کافر سے شادی کر لی مسز فاروقی، مسز قریشی، اور مسز انصاری

کو بھی دے دینا۔"

دعا گو

زبیدہ اُپل

دسمبر کے پہلے ہفتے میں جل دھرا کی حالت دفعتاً زیادہ بگڑ گئی۔ اسے فوراً ہسپتال پہنچایا گیا جہاں دوسرے دن اس نے پران تج دیئے۔

فقیرا دھاڑیں مار مار کر روتا پھرا "صبر کر بچے ـــــ صبر کر ـــــ" غفور بیگم نے اسے دلاسا دیا۔

"اماں جی۔ صبر کیسے کروں میرے لئے ماں تھی تو وہ۔ بھاوج تھی تو وہ بیوی تھی تو وہ" ـــــ اور وہ روتا دھوتا پھر باہر چلا گیا۔

مگر تیسرے دن پھول چننے کے بعد جب وہ شمشان گھاٹ سے واپس لوٹا تو بہت خوش تھا۔ اس نے ہاتھ میں مٹی کا ایک کونڈا اٹھا رکھا تھا جس میں جل دھرا کی راکھ تھی اور اس نے کہا کہ رات کو میں اسے اپنے سرہانے رکھ کر سوؤں گا اور جل دھرا نے جس جون میں جنم لیا ہوگا اس کے پیروں کے نشان راکھ پر بن جائیں گے۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں، باجی ایم اے کے لئے فلسفے کا مطالعہ کر رہی تھیں اور بہت سخت قابل تھیں۔ فقیرا کی بات انہوں نے بڑی دلچسپی سے سنی اور رات کو کھانے کی میز پر بہت دیر تک مسئلہ تناسخ اور عوام کے توہمات کے متعلق والد سے تبادلۂ خیالات کرتی رہیں۔

رات کو سونے سے پہلے فقیرا نے اپنی کوٹھڑی کی کنڈی اندر سے چڑھائی اور راکھ کا کونڈا چارپائی کے نیچے رکھ کر سو گیا۔

صبح سویرے وہ بے حد خوش خوش کھانے کے کمرے میں داخل ہوا فرطِ انبساط سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ "بیگم صاحب ـــــ بڑی بٹیا ـــــ بی بی ـــــ" اس نے اطلاع دی ـــــ "میری جل دھرا گوریا بن گئی ـــــ"

"گوریا بن گئی ـــــ؟" باجی نے دہرایا اور جلدی سے شال لپیٹ کر شاگرد پیشے کی طرف دوڑیں ـــــ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے سرپٹ بھاگی۔

فقیرا کوٹھڑی میں سے کونڈا باہر لایا "بڑی بٹیا ——— دیکھ لیجئے ——— یہ دیکھئے ——— یہ دیکھئے ———" میں نے اور باجی نے آنکھیں پھاڑ کر راکھ کو دیکھا جس پر چڑیا کے پنجوں کے نشان بہت واضح بنے ہوئے تھے۔

"گوریا چڑیا ہے بڑی بٹیا ——— بی بی ———" اس نے کہا اور کونڈا بڑی احتیاط سے اندر لے گیا ———

اس کے بعد سے فقیر ا روز صبح کو گوریا چڑیوں کو دانا ڈالتا۔ ان کے لئے پانی کی کٹوریاں بھر بھر کر رکھتا اور اگر کوئی گوریا روشندان یا دریچے میں سے کسی کمرے میں داخل ہو جاتی تو وہ سارے کام چھوڑ کر چٹکی بجا بجا کر کہتا ——— "چہ چہ چہ ——— آہ ——— آہ ——— آہ ——— لے ——— لے ——— لے ———" اور باجرے کے دانے ہتھیلی پر ڈال کر ساکت کھڑا رہتا اس مقصد کے لئے وہ باجرے کے دانے ہمیشہ جیب میں رکھتا تھا اور اب اُسے مستقل یہ تشویش رہتی تھی کہ ریشم کسی گوریا کو نہ پکڑ لے۔

اس سال چلّے کا جاڑا پڑا تھا۔ ڈائنا روز ابھی ہسپتال میں داخل تھی۔ مسٹر بیکٹ اب میونسپلٹی کے نل پر بھی نظر نہ آتے۔ اب وہ دن بھر پریڈ گراؤنڈ کی ایک بنچ پر دھوپ میں سر جھکائے بیٹھے رہتے اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتے۔ ان کی ٹوپی ان کے پاس بنچ پر کاسہ گدائی کی طرح رکھی رہتی اور درختوں کے زرد پتے گر گر کر اس میں جمع ہوتے رہتے ———

کرسمس نزدیک آ گئی۔ کیرل گانے والوں کی ٹولیاں رات کے وقت ڈالن والا کی سڑکوں پر گھوم گھوم کر اکارڈین اور گٹار پر ولادت مسیح کے گیت گاتی پھرتیں۔ صبح منہ اندھیرے کوئلہ بیچنے والے پہاڑیوں کی آوازیں آتیں جو چیتھڑوں اور گدڑیوں میں ملبوس، کوئلے کی بھاری کنڈیاں نواڑ کی پٹی کے ذریعے ماتھے سے باندھے "کوئلہ چاہیے کوئلہ ———" چلاتے پھرتے۔ سورج اوپر آتا تو سامنے ہمالیہ کا برف پوش سلسلہ کہر نوں میں جگمگا اُٹھتا۔ رات کو جتنا پانی فقیر ا چڑیوں کے لئے باہر رکھتا تھا۔ وہ صبح کو جما ہوا ملتا رات گئے کسی پہاڑی راہگیر کی بانسری کی آواز کہر سے میں تیرتی ہوئی سُنائی دے جاتی۔

کرسمس سے ایک دن پہلے سائمن نے بتایا کہ وہ صبح سویرے اُٹھ کر اسٹوو پر کرسمس پڈنگ تیار کرتے ہیں ، گرجا جاتے ہیں اور اس کے بعد اپنی کوٹھڑی میں بیٹھ کر دن بھر انجیل مقدس پڑھتے ہیں اور کرسمس کے دوسرے روز وہ پڈنگ لے کر آئیں گے۔ بڑے دن کے تحفے کے طور پر وہ باجی کے لئے گلابی نقلی موتیوں کا ننھا سا ہار میرے لئے بالوں کے دو سرخ اور سبز ربن اور ریشم کے لئے ربر کی چھوٹی سی رنگین گیند لائے تھے۔ انہیں بڑے دن کے تحفے کے طور پر دس روپے دیئے گئے۔ جو ان کے لئے اتنی بڑی اور غیر متوقع رقم تھی کہ وہ چند لحظوں تک دس کے نوٹ کو آنکھیں پھاڑے دیکھتے رہے اور پھر ذرا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسے احتیاط سے اندر واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

کرسمس کو تین دن گزر گئے مگر سائمن نہ آئے۔ چوتھے دن ان کی خیر خبر لانے کے لئے فقیرا کو پادری اسکاٹ کے گھر بھیجا گیا۔ اس نے واپس آکر سر جھکا لیا اور آہستہ سے کہا۔ "سائمن صاحب کی مٹی ہو گئی۔ پادری صاحب کا مالی بتا رہا تھا کہ بڑے دن کے روز اس نے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا تو سائمن صاحب چارپائی پر مرے ہوئے پڑے تھے۔ انہیں سردی لگ گئی۔

"ان کے پاس ایک ہی کمبل تھا بیگم صاحب ——— رات کو کوٹ پتلون پہنے پہنے سو جاتے تھے۔"

"بڑا جاڑا پڑ رہا ہے بڑی بٹیا۔ ہمارے ہاں گڑھوال میں تو لوگ باگ اکثر سردی سے اکڑ اکڑ کر مرتے رہتے ہیں، اب اتنا گرم کپڑا کہاں سے لاؤ۔ سردی تو ہر سال ہی پڑتی ہے"

تیسرے پہر کو جب سائمن کے آنے کا وقت ہوا تو ریشم جو سردی کی وجہ سے پچھلے ایک ہفتے سے اپنی ملائم پشمینے کی شال میں لپٹی ٹوکری کے نرم و گرم گدیلوں میں سمٹی سمٹائی بیٹھی رہتی تھی، ٹوکری سے اُتر کر لنگڑاتی لنگڑاتی پھاٹک کی طرف چلی گئی اور پلیا پر بیٹھ کر انتظار میں مصروف ہو گئی۔ کیونکہ سائمن روزانہ راستے میں میجر شیلٹن کے باورچیخانے سے مرغوں اور

پرندوں کی مزے دار ہڈیاں اپنے میلے سے رومال میں احتیاط سے لپیٹ کر اس کے لئے لایا کرتے تھے۔

سامنے نہ آتے۔ دھوپ مدھم پڑ گئی۔ تو اس نے اکتا کر اندر واپس آنے سے پہلے ایک گوریا چڑیا پر تاک لگائی۔ گوریا پیڑ سے اُڑ کر سلوداوک کی شاخ پر جا بیٹھی ریشم نے اس کے تعاقب میں درخت پر چڑھنا چاہا مگر اپنی شکستہ ٹانگ کی وجہ سے جڑ پر سے پھسل کر نیچے آ رہی۔ گوریا پھدک کر اس سے اونچی شاخ پر چلی گئی۔ ریشم نے منہ اُٹھا کر بڑی بے کسی سے کمزور سی میاؤں کی۔ گوریا نے پر پھیلائے اور کھلے، نیلے آسمانوں کی سمت اُڑ گئی۔

جلا وطن

سندر لالہ۔ سجے دُلالہ۔ ناچے سری ہری کیرتن میں۔
ناچے سری ہری کیرتن میں۔
ناچے۔

چوکھٹ پر اکڑوں بیٹھی رام رکھی نہایت انہماک سے چاول صاف کر رہی تھی۔ اس کے گانے کی آواز دبے نک نیچے سرخ کموؤں والی سنسان گلی میں گونجا کی۔ پھر ڈاکٹر آفتاب رائے صدر اعلیٰ کے چبوترے کی اور سے بڑے پھاٹک، کی سمت آتے دکھلائی پڑے۔

"بندگی بھیّن صاحب ——" رام رکھی نے گھونگھٹ اور زیادہ طویل کر کے آواز لگائی۔

"بندگی —— بندگی ——" ڈاکٹر آفتاب رائے نے زینے پر پہنچتے ہوئے بے خیالی سے جواب دیا۔

"راج کھشی ہو بھیّن صاحب ——" رام رکھی نے اخلاقاً دریافت کیا۔

"اور کیا —— مجھے کیا ہوا ہے جو راضی خوشی نہ ہوں گا۔ یہ سوپ ہٹا بیچ میں سے" انہوں نے جھنجھلا کر کہا۔

"بھیّن صاحب ناج پھٹک رہی تھی۔"

"تو ناج پھٹکنے کے لئے تجھے گاڑی بھر راستہ چاہیئے۔ چل ہٹا سب چیز ——"

ڈاکٹر آفتاب رائے نے دنیا بھر کی ڈگریاں تو لے ڈالی تھیں۔ لیکن حالت یہ تھی کہ زری زری سی بات پر بچوں کی طرح خفا ہو جایا کرتے تھے۔ رام رکھی پر برستے ہوئے وہ اوپر آئے

اور مونڈھے پر پیر ٹکا کر انھوں نے اپنی بہن کو آواز دی —— بیجی —— جی ای ای —— جی ای ای —— (چھوڑ رہے ہے اب تلک مورا بھیّن —— ہیم کرن پیار سے کہا کرتیں) دلان کے آگے کھلی چھت پر نیم کی ڈالیاں منڈیر پر جھکی پچھوا ہوا میں سرسرا رہی تھیں، شام کی گہری کیفیت موسم کی اداسی کے ساتھ ساتھ سارے میں بکھری تھی دن بھر نیچے جھوے کے باغ میں شہد کی مکھیاں بھنبھنایا کرتیں اور ہر چیز پر غنودگی ایسی چھائی رہتی۔ آم اب پیلے ہو چلے تھے "ٹھکرائن کی بگیا" میں صبح سے لے کر رات گئے تک روں روں کرتا رہٹ چلا کرتا۔

"آوت ہن بھیّنی صاحب ——" ہیم کرن نے دلان کا پیتل کے نقش و نگار والا کواڑ کھولتے ہوئے غلّے کے گودام میں سے باہر آکر جواب دیا۔ اور کنجیوں کا گچھا ساری کے پلّو میں باندھ کر چھن سے پشت پر پھینکتی ہوئی صحنچی میں آگئیں۔

"جے رام جی کی بھیّن صاحب ——" رسوئیے نے چوکے میں سے آواز لگائی ——

"کٹھل کی ترکاری کھیبو بھیّن صاحب —— ؟"

"ہاں۔ ہاں ضرور کھیبا بھائی ——" ڈاکٹر آفتاب رائے مونڈھے پر سے ہٹ کر ٹہلتے ہوئے تلسی کے چبوترے کے پاس آگئے۔ صحنچی میں رنگ برنگی مورتیاں اور گول پتھر سالگرام سے لے کر بجرنگ بلی مہاراج تک سیندور سے لپی پتی گنگا جل سے نہائی دھوئی قرینے سے سجی تھیں۔ ہیم کرن تھیں تو بڑی سخت رام بھگت لیکن باقی کے سبھی دیوی دیوتاؤں سے سمجھوتہ رکھتی تھیں کہ نہ جانے کون کس سمے آڑے آ جائے۔ سب سے بنائے رکھنی چاہیئے ابھی تسرین رما کانت کھیل کے میدان سے لوٹیں گے۔ آٹھ بجے کھیما کتھک کے توڑے سیکھ کر جمنا مہاراج کے ہاں سے واپس آئے گی۔ پھر چوکے میں کھانا پروسا جائے گا (پیتل کے برتن ٹھنڈی چاندنی میں جھلملائیں گے۔ نیچے آنگن میں رام رکھی کوئی کجری شروع کر دے گی) یہاں پر بالآخر امن تھا اور سکون۔

اب کھیم نیچے پکّے گلیارے میں سے چلتی ہوئی اوپر آرہی تھی (ٹھکرائن کی بگیا میں سے ابھی اس نے کروندے اور کمرکھیں اور مکوہ توڑ کر جلدی جلدی منہ میں ٹھونسے تھے دھا کر دادھی تا کٹ تا —— دھا کر دا —— ارے باپ رے اس نے منڈیر پر سے اوپر جھانک کر

دمینتی سے کہا ——— ماما آئے ہیں۔ بھاگ جا ورنہ ماما مجھے ماریں گے کہ ہر سمے کھیلتی ہے ———
دمینتی بھاگ گئی۔

کھیم چھت پر آئی ملیے سے ڈھیلے ڈھالے فراک میں ملبوس، جس پر موتیوں سے خوب تتلیاں اور پھول بنے بنے تھے، کھینچ کر بالوں کی مینڈھیاں گوندھے۔ ہاتھوں میں چھنا چھن چوڑیاں بجاتی کھیم دتی رلائے زادہ اپنے اتنے پیارے اور اتنے سندر ماما کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔

"نمستے ماما ——— ابھی کتاب لاتی ہوں بس ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں ———"

"چل چڑیل ——— بہانے باز ——— سبق سنا پہلے ———" ڈاکٹر آفتاب رائے نے پیار سے کہا (لیکن یہ کچھ تجربہ انہیں تھا کہ اپنے سے کم عمر لوگوں سے اور کنبہ برادری والوں سے یہ گھر کہ ہستی اور لاڈ پیار کے مقابلے وہ زیادہ کامیابی سے ادا نہ کر پاتے تھے)

"تجھے تو میں انٹرمیڈیٹ میں بھی حساب دلاؤں گا۔ دیکھتی جا ———" انہوں نے پھر بزرگ بننے کی سعی کی۔

"ارے باپ رے ——— !!" کھیم نے مصنوعی خوف کا اظہار کیا۔

"اور تو نے چوڑیاں تو بہت خوبصورت خریدی ہیں ری ———"

"ہی، ہی، ہی ——— ماما ———" کھیم نے دلی مسرت سے اپنی چوڑیوں کو دیکھا۔

"اور تو ساڑی پہنا کر کہ فراک ہی پہنے پھرے گی ——— باؤلی سی ———" (انہوں نے اپنی بزرگی کا احساس خود اپنے اوپر طاری کرنا چاہا)

"جی ماما ———" کھیم کے ذہن میں وہ ساڑیاں جھما جھم کرتی کوند گئیں۔ جو ماں کے صندوقوں میں ٹھنسی تھیں۔ وہ تو خدا سے چاہتی تھی کہ کل کی پہنتی آج ہی وہ ساڑیاں پہن ڈالے مگر ہیم کرن ہی پر انگریزیت سوار تھی۔ ایک تو وہ یہ نہیں بھولی تھیں کہ تھیں تو وہ جون پور کے اس ہیڈمڈ وقیانوسی سریواستو اگھرانے کی بٹیا ——— پر ان کا بیاہ ہوا تھا۔ الہ آباد کے اتنے فیشن ایبل کنبے میں جس کے سارے افراد سول لائنز میں رہتے تھے اور جوتے پہنے پہنے کھانا کھاتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پانی پیتے تھے اور گودو ہوا ہوئے اب ان کو سات برس ہونے آئے تھے اور تب سے وہ میکے ہی میں رہتی تھیں۔ لیکن محلے پر ان کا رعب تھا۔ کیوں کہ وہ الہ آباد

کے رائے زادوں کی بہو تھیں ـــــ دوسرے یہ کہ یہ فراک کانفیشن ڈاکٹر سین گپتا کے ہاں سے چلا تھا۔ ڈاکٹر سین گپتا ضلع کے سول ہسپتال کے اسسٹنٹ سرجن تھے اور ہسپتال سے ملحق ان کے پیلے رنگ کے اجاڑ سے مکان کے سامنے ان کی پانچوں بیٹیاں رنگ برنگے فراک پہنے دن بھر اودھم مچایا کرتیں۔ شام ہوتی تو آگے آگے ڈاکٹر سین گپتا دھوتی کا پلّا نہایت نفاست سے ایک انگلی میں سنبھالے۔ ذرا پیچھے ان کی بی بی سُرخ کنارے والی سفید ساڑھی پہنے، پھر پانچوں کی پانچوں لڑکیاں سیدھے سیدھے بال کندھوں پر بکھرائے چلی جا رہی ہیں۔ ہوا خوری کرنے۔ افوہ۔ کیا ٹھکانہ تھا بھلا بس ہر بنگالی گھرانے میں یہ لڑکیوں کی فوج دیکھ لو۔ ہیم کرن کو ڈاکٹر سین گپتا سے بڑی ہمدردی تھی۔ ہیم کی ان سب سے بہت گھٹتی تھی خصوصاً مونڈیرا سے۔ اور اسکول کے ڈرامے کے دنوں میں تو بس ہیم اور مونڈیرا ہی سب پر چھائی رہتیں۔ کیا کیا ڈرامے مہادیوی کنیا پاٹھ شالہ نے نہ کر ڈالے ـــــ "نل دمینتی" ـــــ "اور شکنتلا ہریش چندر" اور "راج رانی میرا ـــــ" اور اوپر سے ڈانس الگ ـــــ گر بابھی ہو رہا ہے کہ آ۔ تیرے گنگا پار نیرے جمنا بیچ میں ٹھاڑے ہیں نندلال" ـــــ اور آپ کا خدا بھلا کرے رادھا کہ شنا ڈانس بھی لیجئے کہ میں تو گوردھر آگے ناچوں گی ـــــ جی ہاں۔ اور وہ گگری والا ناچ بھی موجود ہے کہ چلو چلو سکھی سکھیا ری چلو پنگھٹ بھرا پانی ـــــ اور ساتھ ساتھ مونڈیرا بین گپتا ہے کہ فراٹے سے ہارمونیم بجا رہی ہے۔

ایسے ہونے کو تو مسلمانوں کا بھی ایک اسکول تھا۔ انجمن اسلام گرلز اسکول ـــــ وہاں یہ سب ٹھاٹھ کہاں۔ بس بارہ وفات کی بارہ وفات میلاد شریف ہو جایا کرتا اور اس میں کھڑے ہو کر لڑکیوں نے خاصی بے سُری آوازوں میں پڑھ دیا:۔

تم ہی فخر انبیا ہو۔ یا نبیؐ سلام علیکا ـــــ چلیے قصّہ ختم۔ ایک مرتبہ ایک سر پھری ہیڈ مسٹرس نے جو نئی نئی لکھنؤ سے آئی تھی "روپ متی باز بہادر" خواتین کے سالانہ جلسے میں اسٹیج کروا دیا تو جنابِ عالی لوگوں نے اسکول کے پھاٹک پر پکٹنگ کر ڈالی ـــــ اور روزنامہ صدائے حق نے پہلے صفحے پر جلی حروف میں شائع کیا:۔

"ملتِ اسلامیہ کی عزت کا جنازہ ـــــ

گرلز اسکول کے اسٹیج پر نکل گیا

مسلمانو! تم کو خدا کے آگے بھی جواب دینا ہوگا ـــــ بنات اسلام کو رقص و سرود کی تعلیم ـــــ اسکول کو بند کرو ـــــ (یہ سب قصے کھیم کی مسلمان سہیلی کشوری اسے سُنایا کرتی تھی جو پڑوس میں رہتی تھی) صدرِ اعلےٰ کے چبوترے کے آگے والے مکان میں وہ اسلامیہ گرلز اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس کا بڑا بھائی اصغر عباس، سرین اور رما کانت کے ساتھ ہاکی کھیلنے آیا کرتا تھا۔ ویسے پڑھتے وہ لوگ بھی الگ الگ تھے۔ سرین اور رما کانت ڈی اے وی کالج میں تھے۔ اصغر عباس فیض اسلام کنگ جارج انٹر کالج میں۔

"کیوں ری ـــــ الف اسے کرنے کہاں جائے گی۔ جولائی آ رہی ہے۔ بنارس جائے گی یا لکھنؤ ـــ ؟" ڈاکٹر آفتاب رائے نے چوکے میں بیٹھے ہوئے سوال کیا۔

اب یہ ایک ایسا ٹیڑھا اور اچانک سوال تھا جس کا جواب دینے کے لئے کھیم دتی ہرگز تیار نہ تھی۔ دونوں جگہوں سے متعلق اسے کافی انفرمیشن حاصل تھی۔ لیکن دو ٹوک فیصلہ وہ فی الحال کسی ایک کے حق میں نہ کر سکتی تھی۔ بنارس میں ایک تو یہ کہ چوڑیاں بہت عمدہ ملتی تھیں۔ لیکن لکھنؤ کو بھی بہت سی باتوں میں فوقیت حاصل تھی۔ مثلاً سینما تھے اور دس سینماؤں کا ایک سینما تو خود مہیلا ودیالہ تھا۔ جہاں اسے بھیجنے کا تذکرہ ماما نے کیا تھا۔ پر وہ غالباً اسے بہر صورت ہر جگہ کرنا تھا۔ تانگے پر پردہ یہاں بھی ہیم کرن اپنے اور اس کے لئے بندھواتی تھیں اور ماما اتنا بڑا ڈنڈا لئے سر پہ جو موجود تھے۔

یہ ماما اس کے آج تک پلّے نہ پڑے۔ ولایت سے ان گنت ڈگریاں لے آئے تھے۔ یونیورسٹی میں پروفیسری کرتے تھے۔ تاریخ پر کتابیں لکھتے تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے چوں چوں کے مربّہ تھے کھیم کے ماما۔

رہے رما کانت اور سرین۔ تو رما کانت تو شاعر آدمی تھا۔ سارے مقامی مشاعروں میں جا کر دو غزلے سہ غزلے پڑھ ڈالتا اور حضرت ناشاد جون پوری کے نام نامی سے یاد کیا جاتا۔ سرین اس کے برعکس بالکل انجینئر تھا اس سال وہ بھی انٹر کر کے بنارس انجینئرنگ کالج چلا جائے گا۔ باقی کے سارے کنبے برادری کے بہن بھائی یوں ہی بکواس تھے۔ اس سلسلے میں اس کی گوتیاں کشوری یعنی کشور آرا بیگم کے بڑے ٹھاٹھ تھے۔ اس کے بے شمار

رشتے کے بھائی تھے اور سب ایک سے ایک سورما۔ یہاں کسی کے سورما پنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ کسی نے آج تک اس سے یہ نہ کہا کہ چل کھیم تجھے سرکس یا نوٹنکی ہی دکھلا دیں ——— نوٹنکی کے دنوں میں رستو یا تک لہک لہک کر گاتا اب بھی ہے میں نے ٹھانی لاؤں گا نوٹن کی رانی ——— کہاں کشوری کے ماجد بھائی ہیں تو اس کے لئے لکھنؤ سے چوڑیاں لئے چلے آتے ہیں۔ اکرام بھائی ہیں تو کشوری ان کے لئے جھپا جھپ پُل اوور بُن رہی ہے۔ اشفاق بھائی ہیں تو کشوری کو بیٹھے انگریزی شاعری پڑھ سا رہے ہیں۔ ان بھائیوں اور کھیم کے بھائیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کہاں کی چوڑیاں اور پُل اوور۔ یہاں تو جوتیوں میں دال بٹتی تھی۔

ہیم کرن کو گھر کے کام دھندوں ہی سے فرصت نہ ملتی۔ آفتاب رائے ان کے لئے بڑا سہارا تھے۔ وہ ہر تیسرے چوتھے مہینے لکھنؤ سے آکر مل جانے رہنے والے ان کے بھیّن صاحب جون پور ہی کے تھے۔ پر یہاں اُن کی کسی سے ملاقات نہ تھی " ضلع کے روسا اور مقامی عمائدین شہر" میں ان کا شمار تھا۔ پر آپ کا خیال اگر یہ ہے کہ ڈاکٹر آفتاب رائے جون پور کے اُن معززین کے ساتھ اپنا وقت خراب کریں گے تو آپ غلطی پر ہیں۔ حکام سے اُن کی کبھی نہ بنی۔ انٹلکچوئیل آدمی تھے۔ ان سول سروس اور پولیس والوں سے کیا دماغ سوزی کرتے۔ جگن ناتھ جین آئی سی ایس جب نیا نیا حاکم ضلع ہو کر آیا تو اُس نے کئی بار ان کو کلب میں بلا بھیجا۔ پر یہ ہر گز نہ گئے۔ رئیس الدین کاظمی ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نے دعوت کی۔ اس میں بھی نہ پہنچے اور تو اور ولایت واپس جاتے وقت مسٹر چارلس مارٹن نے کوئین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کی پرنسپل شپ پیش کی۔ لیکن کھیم کے ماما نے اسے بھی رد کر دیا۔ یوں تو خیر کانگریسی وانگریسی ہونا کوئی خاص بات نہیں۔ شہر اور قصبہ جات کا ہر ہندو جو سرکاری ملازم نہ تھا۔ گھر پر ترنگا لگاتا تھا اور ہر مسلمان کے اپنے دسیوں مشغلے تھے۔ احرار پارٹی تھی۔ شیعہ کانفرنس تھی۔ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی میں مسلمان بھرے ہوتے تھے۔ مسلم لیگ کا تو خیر اس وقت کسی نے نام بھی نہ سُنا تھا۔ پر بہت سے مسلمان اگر انصاف کی پوچھئے تو کچھ بھی نہ تھے یا شاعری کرتے تھے یا مجلسیں پڑھتے تھے۔

تو کہنے کا مطلب یہ کہ کوئی ایسی تشویشناک بات نہ تھی۔ پر ڈاکٹر آفتاب رائے

کی زیادہ تر لوگوں سے کبھی نہ پٹی۔ ارے صاحب یہاں تک سُنا گیا ہے کہ ہری پورہ کانگریس کے موقع پر انہوں نے سب کو کھری کھری سُنا دیں۔ گو یہ راوی کو یاد نہیں کہ انہوں نے کیا کہا تھا۔

ضلع کی سوسائٹی جن عناصر پر مشتمل تھی۔ انہیں سے ڈاکٹر آفتاب رائے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ وسط شہر میں مہاجنوں، ساہوکاروں اور زمینداروں کی اونچی حویلیاں تھیں۔ یہ لوگ سرکاری فنڈوں میں ہزاروں روپیہ چندہ دیتے۔ اسکول کھلواتے، مجرے اور مشاعرے اور دنگل کرواتے۔ جلسے جلوس اور سرپھٹول بھی ان ہی کی زیر سرپرستی منعقد ہوتے۔ ہندو مسلمانوں کا معاشرہ تقریباً ایک تھا۔ وہی تیج تہوار میلے ٹھیلے محرّم رام لیلا۔ پھر اس سے اونچی سطح پر وہی مقدمے بازیاں۔ موکّل۔ گواہ پیشی کار سمن۔ عدالتیں۔ صاحب لوگوں کے لئے ڈالیاں۔

شہر کے باہر ضلع کا ہسپتال تھا۔ لق و دق ہری گھاس کے میدانوں میں بکھری ہوئی اُداس پیلے رنگ کی عمارتیں۔ کچّے احاطے۔ نیم کے درختوں کی چھاؤں میں، آؤٹ ڈور مریضوں کے ہجوم۔ گرد آلود یکّوں کے اڈّے۔ سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے دو دو آنے میں خط لکھ کر دینے والے بہت بوڑھے اور شکستہ حال منشی، جو دھاگوں والی عینکیں لگائے دھندلی آنکھوں سے راہگیروں کو دیکھتے۔ پھر گلیاں تھیں۔ جن کے کھڑّوں کے فرش پر پانی بہتا تھا۔ سیاہی مائل دیواروں پر کوئلے سے اشتہار لکھے تھے۔ حکیم مارکہ دھاگہ خرید یئے۔ پری برانڈ بیڑی پیو۔ ایک پیسہ باپ سے لو جائیے جا کر ماں کو دو۔ آگیا۔ آگیا۔ آگیا ـــــ سالِ رواں کا سنسنی خیز فلم "لہری راجہ" آگیا۔ جس میں منش مادھوری کام کرتی ہے۔

پھر سایہ دار سڑکوں کے پرے آم اور مولسری میں چھپی ہوئی حکّام ضلع کی بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ انگریزی کلب تھا۔ جس میں بے اندازہ خنکی ہوتی۔ چپ چاپ اور سائے کی طرح چلتے ہوتے مؤدب اور شائستہ "بیرے" انگریز اور کالے صاحب لوگوں کے لئے ٹھنڈے پانی کی بوتلیں اور برف کی بالٹیاں لا کر گھاس پر رکھتے، نیلے پردوں کی

قناتوں کے پیچھے ٹینس کی گیندیں سبزے پہ لڑھکتی رہتیں۔

۲

اور سول لائنز کی اس دُنیا میں اوپر سے آئی کنول کماری جین جگن ناتھ جین آئی سی ایس کی بالوں کٹی بیوی جس نے لکھنؤ کے مشہور انگریزی کالج ازابلا تھوبرن میں پڑھا تھا اور جو گیند بلا کھیلتی تھی۔ کلب میں چہل پہل ہو گئی ــــــ گنتی کی کل تین تو میمیں ہی تھیں۔ کلب میں کوئین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کے انگریز پرنسپل کی میم ایک زنانہ ہسپتال کی بڑی ڈاکٹرنی میم مس بک کنزی دو۔ اور اسے پی مشن گرلز ہائی اسکول کی بڑی استانی مس سالفرڈ جو چُن چنیا میم کہلاتی تھی کہ نوکروں پر حکم چلاتی بہت تھی۔ ان تین کے علاوہ ڈاکٹرنی میم کی چھوٹی بہن مس اولیو مک کنزی تھی جو اپنی بہن سے ملنے نینی تال سے آئی ہوتی تھی اور ضلع کے غیر شادی شدہ حکّام کے ساتھ ٹینس کھیلنا اُس کا خاص مشغلہ تھا اور اس میں ایسا کچھ اس کا جی لگا تھا کہ اب واپس جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ شام ہوتے ہی وہ کلب میں آن موجود ہوتی اور وے مسٹر سکسینہ اور وے مسٹر فرحت علی۔ اور وے مسٹر پانڈے سبھی تو اس کے چاروں طرف کھڑے دانت نکوسے ہنس رہے ہیں۔ اس ایک میسا نے بھائی لوگوں کو ننگی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ باقی ماندہ حضرات بھی کہتے تھے کہ میاں کیا مضائقہ ہے۔ جون پور ایسی ڈل جگہ پر مس مک کنزی کا دم ہی غنیمت جانو۔ اب غور کرنے کا مقام ہے کہ مس شبیرہ حمایت علی جو دوسری لیڈی ڈاکٹر تھیں۔ ان کا تو نام سُن کر ہی جی بیٹھ جاتا تھا۔ مگر وہ خود بے چاری بڑی اسپورٹنگ آدمی تھیں۔ برابر جی داری سے ٹینس کھیلنے آیا کرتیں۔ لکھنؤ کے کنگ جارجز کی پڑھی ہوئی تھیں۔ لندن جا کر ایک ڈپلوما بھی مار لائی تھیں لیکن کیا مجال جو کبھی بد دماغی دکھلا جاویں۔ لوگ کہتے تھے۔ صاحب بڑی شریف ڈاکٹرنی ہے۔ بالکل گائے سمجھئے گائے۔ جی ہاں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ آپ یہ توقع کریں کہ ہر لیڈی ڈاکٹر افسانوں اور ناولوں کی روایت کے مطابق بالکل حور شمائل، مہ وش، پری پیکر ہو۔ اچھی آدمی کا بچہ تھیں بلکہ ایک مرتبہ تو ڈسٹرکٹ جج مسٹر

کاظمی کی بیگم صاحب نے مسٹر فرحت علی سے تجویز بھی کی تھی کہ بھیّا آزادی کا زمانہ ہے مس شبیرہ ہی سے بیاہ کر لو۔ یہ جو سال کے سال چھٹیوں میں تمہاری اماں تمہیں لڑکیاں دیکھنے کے لئے نینی تال مسوری بھیجا کرتی ہیں۔ اس دردِ سر سے بھی نجات ملے گی اور کیا۔

راوی کہتا ہے کہ فرحت علی نے جوان دنوں بڑے معرکے کا سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ بیگم کاظمی کے سامنے کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کی تھی اور تھر تھر کانپا تھا اور دست بستہ یوں گویا ہوا تھا کہ آئندہ وہ مس شبیرہ حمایت سے جو گفتگو کرے گا۔ وہ صرف چار جملوں پر مشتمل ہو گی ـــــ آدابِ عرض۔ آپ اچھی طرح سے ہیں ؟ جی ہاں میں بالکل اچھی طرح ہوں۔ شکریہ۔ آداب عرض۔

مصیبت یہ تھی کہ جہاں کسی شامت کے مارے نے کسی "غیر منسلک" خاتون محترم سے سوشل گفتگو کے دوران میں ان چار جملوں سے تجاوز کیا تو بس سمجھ لیجئے ایکاٹوٹی ہو گئی۔

تو غرضیکہ راوی دریا کو یوں کوزے میں بند کرتا ہے کہ کنول کماری کے میاں کا تقرر اس جگہ پر ہوا (انگریز حاکموں کی اصطلاح میں صوبے کا ضلع "اسٹیشن" کہلاتا تھا)

اور نئے حاکم ضلع کے اعزاز میں کنور نرنجن داس رئیسِ اعظم جون پور نے (کہ یہ سارا کا سارا ایک نام تھا) اپنے باغ میں بڑی دھوم کی دعوت کی۔ چبوترے پر زرتار شامیانہ تانا گیا رات گئے تک جلسہ رہا۔ بیبیوں کے لئے اندر علیحدہ دعوت تھی۔ مصرانیوں نے کیا کیا کھانے نہ بنائے تھے۔ مسلمان مہمانوں کے لئے باؤلے ڈپٹیوں کے وہاں سے باورچی بلوائے گئے تھے (باؤلے ڈپٹیوں کا ایک خاندان تھا جس میں عرصہ ہوا ایک ڈپٹی صاحب کا دماغ چل گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ پورا خاندان باؤلے ڈپٹیوں کا گھرانا کہلاتا تھا) کہار آواز لگاتے۔ اجی باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں سے سواریاں آتی ہیں۔ اندر والوں مہریوں سے کہا جاتا ارے باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں بنو نادیتی آنا دی لام رکھی جھاڑو پٹی۔

بیگم کرن ایسے تو کہیں آتی جاتی نہ تھیں۔ پر رانی نرنجن داس کی زبردستی پر وہ بھی سوت میں آگئی تھیں۔ کلکٹر کی بیوی سے ملنے کے لئے عمائدین شہر کی بیویوں نے کیا کیا جوڑے نہ پہنے تھے۔ لیکن جب خود کنول کماری کو دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تو پوری میم ہے۔

غضب خدا کا ہاتھوں میں چوڑیاں تک نہ تھیں۔ ناک کی کیل تو گئی چولھے بھاڑ میں ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی پہنے گاؤ تکیے سے ذرا ہٹ کر بیٹھی وہ سب سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی رہی۔

"اے لو بٹیا تم نے تو سہاگ کی نشانی ہی کو جھاڑو پٹے فیشن کی بھینٹ کر دیا" صدر اعلیٰ کی بیگم نے ناک پر انگلی رکھ کر اس سے کہا۔

"اے ہاں سچ تو ہے کیا ڈنڈا ایسے ہاتھ لئے بیٹھی ہو۔ دور پار رچھا بتیں پھوپیں دیکھے، جی سے ہول آتا ہے!" بیگم کاظمی نے بھی صاد کیا۔

کھیم کی تو بہر حال، آج عید تھی۔ اس نے تیز جامنی رنگ کی بنارسی ساڑھی باندھی تھی۔ پاؤں میں رام جھول پہنے تھے۔ سونے کی کردھنی اور دوسرے سارے گہنے پاتنے علیحدہ کندن کا چھپکا۔ مگر کشوری بھی بہن آئی تھی لیکن کشوری کی اماں (جو محلے میں بڑی بھاوج کے نام سے یاد کی جاتی تھیں) بن بیاہی لڑکیوں کے زیادہ سنگار پٹار کی قطعی قائل نہ تھیں۔ ان کے یہاں تو لڑکیاں بالیاں مانگ تک بالوں میں نہ کاڑھ سکتی تھیں۔ پر اب زمانے کی ہوا کے زیر اثر نئی پود کی لڑکیوں نے سیدھی اور آڑی مانگیں کاڑھنی شروع کر دی تھیں۔ کھیم دور سے بیٹھی کنول کماری کو دیکھتی رہی کتنی سندر ہے اور پھر ایم اے پاس، ایم اے پاس لڑکی کھیم اور کشوری کی نظروں میں بالکل دیوی دیوتا کا درجہ رکھتی تھی۔

کنول کماری جین ساری مہمان بیبیوں سے ہنس ہنس کر سخت خوش اخلاقی سے گفتگو کرنے میں مصروف تھی (اور ساری محفل نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکی سابق کلکٹر کی بیوی اس چڑیل مسز بھارگوا سے کہیں زیادہ اچھی اور ملنسار ہے رانی بٹیا۔ ہے بالکل)

دالان کے گملوں کی اوٹ میں کھیم اور کشوری بیٹھی تھیں اور منٹ منٹ پر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئی جاتی تھیں۔ اب ایک بات ہو تو بتلائی جائے۔ دسیوں تھیں۔ مثلاً موٹی مسرانی کی چال ہی دیکھ لو۔ اور اوپر سے کنور رنجن داس صاحب خانہ کی اسٹیٹ کے منیجر صاحب لالہ گنیش مہاشے بار بار ڈیوڑھی میں آن کر للکارتے ــــ "اجی پردہ کر لو کہار اندر آ رہے ہیں"، تو ان کے حلق میں سے ایسی آواز نکلتی جیسے ہارمونیم کے پردوں کو برساتی ہوا مار گئی ہو۔

اب کے سے جب ماما لکھنو سے گھر آئے تو کھیم نے دعوت کی ساری داستان ان کے گوش گذار کر دی کنول کماری ایسی۔ اور کنول کماری ویسی، ماما چپکے بیٹھے سنتے رہے۔

۳

کھیم جب رات کا کھانا کھا کر سونے چلی گئی اور سارے گھر میں خاموشی چھا گئی تو ڈاکٹر آفتاب رائے چھت کی منڈیر پر آ کھڑے ہو گئے۔ باغ اب سنسان پڑے تھے۔ گرمیوں کا موسم نکلتا جا رہا تھا اور گلابی جاڑے شروع ہو گئے تھے۔ پروائی ہوا آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ نیچے ٹھکہ این بگیا والی گلی کے برابر سے مسلمانوں کا محلہ شروع ہوتا تھا، اس کے بعد بازار تھا۔ جس میں مدھم گیس اور لالٹین کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پھر پولیس لائنز کے میدان تھے۔ اس کے بعد کچہری اور سول لائنز۔

سول لائنز میں، حاکمِ ضلع کی بڑی کوٹھی تھی۔ جس پہ یونین جیک جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں بڑے سکون سے لہرا رہا تھا۔ سارے میں یہ تھکی ہوئی خاموشی چھائی تھی۔ سامنے سلطان حسین شرقی کے زمانے کے اونچے پھاٹک اور مسجدوں کے بلند مینار رات کے آسمان کے نیچے پانچ سو سال سے اسی طرح ساکت اور صامت کھڑے تھے۔ زندگی میں بے کیفی تھی اور اداسی اور ذلت تھی اور شدید غلامی کا احساس تھا۔

عمر بھر آفتاب رائے نے یوں ہی سوچا تھا کہ اب وہ اور کچھ نہ کریں گے لیکن دنیا موجود تھی۔ وہ کام بھی کرتے۔ کھانا بھی کھاتے سال میں چار دفعہ جون پور آ کر جی جی سے دماغ سوزی بھی کرتے زندگی کے بھاری پن کے باوجود گاڑی تھی کہ چلے جا رہی تھی۔

کنول کماری اس منظر کے پرے موسری کے جھنڈ کے دوسری طرف یونین جیک کے سائے میں براجتی تھی۔ بہت سے لوگ ہیں کہ جو راستہ سوچا اختیار کر لیا۔ آرام سے اس پر چلتے چلے گئے۔ یہاں کسی راستے کا تعین ہی نہ ہو پاتا تھا۔ ایک کے بعد ایک سب اِدھر اُدھر نکل گئے تھے۔ آفتاب رائے وہیں کے وہیں تھے۔

کنول کماری ــــ؟ لاحول ولاقوۃ

جب وہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے لئے ولایت جا رہے تھے تو کنول نے اُن سے کہا تھا "آفتاب بہادر تم کو اپنے اوپر بڑا مان ہے۔ پر وہ مان ایک روز ٹوٹ جائے گا جب میں بھی کہیں چلی جاؤں گی"

"تم کہاں چلی جاؤ گی؟"

"افوہ ـــــ لڑکیاں کہاں چلی جاتی ہیں ـــــ؟"

"گویا تمہارا مطلب ہے کہ تم بیاہ کر لو گی؟"

"میں خود تھوڑا ہی بیاہ کرتی پھروں گی۔ ارے عقلمند داس میرا بیاہ کر دیا جائے گا" اس نے جھنجھلا کر جواب دیا تھا۔

"ارے جاؤ ـــــ" آفتاب رائے خوب ہنسے تھے ـــــ "میں اس جھانسے میں آنے والا نہیں ہوں۔ تم لڑکیوں کی پسند بھی کیا شے ہے۔ تم جیسی موڈرن لڑکیاں آخر میں پسند اسی کو کرتی ہیں جو ان کے سماجی اور معاشی معیار پر پورا اترتا ہے باقی سب بکواس ہے۔ پسند اضافی چیز ہے تمہارے لئے ـــــ"

"ہاں ـــــ بالکل اضافی چیز ہے۔ آفتاب بہادر ـــــ" وہ غصّے کے مارے بالکل خاموش ہو گئی تھی۔

وہ چاند باغ میں تھی۔ آپ بادشاہ باغ میں بڑی دھوم دھام سے براجتے تھے یونین کی پریذیڈنٹی کرتے تھے۔ تقریریں بگھارتے تھے۔ ایک منٹ نچلے نہ بیٹھتے تھے۔ تاکہ کنول نوٹس نہ بھی لیتی ہو تو لے۔ وہ اے پی سین روڈ پر رہتی تھی اور سائیکل پر روز چاند باغ آیا کرتی تھی۔ لکھنؤ کی بڑی نمائش ہوتی تو وہ بھی اپنے کنبے کے ساتھ میوزک کانفرنس میں گئی۔ وہاں یونیورسٹی والوں نے سہگل کو اپنے محاصرے میں لے رکھا تھا جس گانے کی یونیورسٹی اور چاند باغ کا مجمع فرمائش کرتا۔ وہی سہگل کو بار بار گانا پڑتا۔ بھائی آفتاب بھی شور مچانے میں پیش پیش۔ لیکن اگلی صف میں کنول کو بیٹھا دیکھ کر فوراً سٹ پٹا کر چپ ہو گئے اور سنجیدگی سے دوستوں سے بولے کہ یار چھوڑو کیا ہلڑ مچا رکھا ہے اس پر عزت نے عسکری بلگرامی سے کہا آج ان دونوں پیارے دوستوں کو مرے بھی اتنا عرصہ ہو گیا تھا۔ منڈیر پر کھڑے ہوئے

آفتاب رائے کو خیال آیا، عزت نے عسکری سے کہا، استاد یہ اپنا آفتاب جو ہے یہ اس لونڈیا پر اچھا امپریشن ڈالنے کی فکر میں غلطیاں و پیچاں ہے۔ اب خداوند تعالےٰ ہی اس پر رحم کرے ــــ

"بی اے کے بعد تم کیا کرو گی ــــ؟" ایک روز آفتاب رائے نے کنول سے سوال کیا۔

"مجھے کچھ پتہ نہیں ــــ" کنول نے کہا تھا۔ اس میں گویا یہ اشارہ تھا کہ مجھے تو کچھ پتہ نہیں تم ہی کوئی پروگرام بناؤ۔

لیکن کچھ عرصے بعد وہ سیدھے سیدھے ولایت نکل گئے۔ کیونکہ غالباً ان کی زندگی ان کے لئے، ان کے گھر والوں کے لئے، کنول کے وجود سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ پھر ان کی آئیڈیالوجی تھی (یار کیا بکواس لگا رہی ہے۔ عزت نے ڈپٹ کر کہا تھا)

پر ایک روز، لندن میں، جب وہ سیینٹ ہاؤس کی لائبریری سے گھر کی اور جا رہے تھے تو راہ میں انہیں مہی پال نظر آیا۔ جس نے دور سے آواز لگائی ــــ "چا پینے چلو تو ایک واقعۂ فاجعہ گوش گزار کروں۔ کنول کماری کا جگن ناتھ جین سے بیاہ ہو گیا۔ وہی جو سن پینتیس کے بیچ کا ہے ــــ"

لڑکیوں کی عجیب بے ہودہ قوم ہے۔ اس روز آفتاب رائے اس نتیجے پر پہنچے "ان کو سمجھنا ہمارے تمہارے بس کا روگ نہیں۔ میاں وہ جو بڑی انٹلکچوئل کی ساس بنی پھرتی تھی۔ ہو گئی ہو گی۔ اب گلیڈ ــــ جگن ناتھ جین مائی فٹ۔ کون تھا یہ اُلّو ــــ میں نے کبھی دیکھا ہے اسے ــــ؟" مہی پال کے کمرے میں پہنچ کر آتشدان سلگاتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔

مہی پال رائے زادہ کھڑکی میں جھکا باہر سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں ٹھیلے والے کوئلی دن بھر گلا پھاڑ کر چلاتے رہنے کے بعد اب اپنے اپنے تہ کاریوں کے ٹھیلے گھسیٹتے ہوئے سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ شام کا دھندلکا سارے میں بکھر گیا تھا۔ زندگی بہت

اُداس ہے اس نے خیال کیا تھا۔ ہاں، اس نے آفتاب رائے سے کہا تھا میں نے اسے پٹنے میں دیکھا تھا۔ کالا سا آدمی ہے۔ عینک لگاتا ہے۔ کچھ کچھ لومڑی سے ملتی جلتی اس کی شکل ہے۔

"بے وقوف بھی ہے ——؟" آفتاب رائے نے پوچھا تھا۔

"خاصہ بے وقوف ہے ——" مہی پال رائے زادہ نے جواب دیا تھا۔

"—— پھر کنول اس کے ساتھ خوش کیسے رہ سکے گی؟" آفتاب رائے نے مہی پال سے مطالبہ کیا۔

"میاں آفتاب بہادر ——" مہی پال نے مڑ کر ان کو مخاطب کیا۔ "یہ جتنی لڑکیاں ہیں نا —— جو افلاطونِ زماں بنی پھرتی ہیں۔ یہ بے وقوفوں کے ساتھ ہی خوش رہتی ہیں آیا عقل میں تمہاری ——؟"

"کیا بکواس ہے ——" آفتاب رائے نے بڑی آزردگی سے کہا۔

اب مہی پال رائے زادہ کو صریحاً غصہ آگیا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا تھا —— "تو میاں تم کو روکا کس نے تھا۔ اس سے بیاہ کرنے کو۔ جواب مجھے بور کر رہے ہو۔ کیا وہ تم سے خود آکر کہتی کہ میاں آفتاب بہادر میں تم سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔ ایں ——؟ اور فرض کرو اگر وہ خود سے ہی انکار کر دیتی تو کیا قیامت آجاتی میاں لڑکی تھی یا ہوّا۔ کیا مارتی وہ تم کو جھاڑو لے کر —— کیا کرتی ——؟ تم نے لیکن کہہ کے ہی نہیں دیکھا۔ خیر چلو —— خیر بیت گئی گذر گئی۔ اچھا ہی ہوا۔ کہاں کا جھگڑا مول لیتے بے کار میں۔ کیونکہ میرا متولہ ہے (اس نے انگلی اٹھا کر عالمانہ انداز میں کہا) کہ شادی کے ایک سال بعد سب شادیاں ایک سی ہو جاتی ہیں۔ تم کو تو جگن ناتھ جین کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ کہ اس نے تم کو ایک بارِ عظیم سے سبکدوش کیا۔ بلکہ وہ تمہارے حق میں بالکل دافعِ بلیات ثابت ہوا۔"

"بے ہودہ ہیں آپ انتہا سے زیادہ ——" آفتاب رائے نے جھنجھلا کر کہا تھا۔

لکھنو لوٹ کر ایک روز آفتاب رائے اتفاقاً اسے پی سین روڈ پر سے گزرے۔ سامنے کنول کے باپ کی سُرخ رنگ کی بڑی سی کوٹھی تھی۔ جس کی برساتی پر کاسنی پھولوں کی بیل

پھیلی تھی۔ یہاں ایک زمانے میں کتنا اودھم مچتا تھا کنول کے سارے بہن بھائیوں نے مل کر اپنا آرکیسٹرا بنا رکھا تھا۔ کوئی بانسری بجاتا، کوئی جل ترنگ۔ کنول طبلہ بجاتی۔ ایک بھائی وائلن کا استاد تھا۔ سب مل کر جیسے دھنیں شروع کر دیتے۔ مورے مندرا اب لوں نہیں آئے ——— کیسی چوک بھئی مو سے آلی ——— پھر ارچنا بنرجی آجاتی اور کوئل ایسی آواز میں گاتی ——— آئی پوہ، موڑی چھیوڑ نا مگر سکر یو جوئے ہو ——— اتوار کو دن بھر بیڈ منٹن ہوتا۔ ہر سمے تو آفتاب رائے ان لوگوں کے یہاں موجود رہتے تھے اور جب ایک روز خود ہی چپکے سے ولایت کھسک لیے تو ان لوگوں کا کیا قصور۔ وہ لڑکی کو بنک کے سیف ڈپازٹ میں تو ان کے خیال سے رکھنے سے رہے اور جگن ناتھ جیسی ایسا رشتہ تو بھائی قسمت والوں ہی کو ملتا ہے۔

پھر ایک روز ابین آباد میں انہوں نے کنول کو دیکھا: وہ کار سے اُتر کر اپنی سسرال والوں کے ساتھ پارک کے مندر کی اور جا رہی تھی اور سُرخ ساڑھی میں ملبوس تھی اور آلتا اس کے پیروں میں تھا۔ آلی ری سائیں کے مندر دبا بار آؤں۔ کر آؤں سولہ سنگار وہ گرمیوں کی شام تھی۔ ابین آباد جگمگا رہا تھا۔ ہوا میں موتیا اور خس کی مہک تھی اور مندر کا گھنٹہ یکسانیت سے بجے جا رہا تھا۔

اب آفتاب رائے یونیورسٹی میں تاریخ کی چیئر سنبھالے ہوئے تھے ساتھیوں کی محفل میں خوب اودھم مچاتے۔ ٹینس کھیلتے اور صوفی ازم کی تاریخ پہ ایک مقالہ لکھ رہے تھے۔ میں وہ نہیں ہوں جو میں ہوں ... جو میں نہیں ہوں۔ ہر چیز باقی ساری چیزیں ہیں۔ بھگوان کرشن جب ارجن سے کہتے ہیں ——— او پرنس ارجنا ——— ڈارسے جا ——— عسکری ٹرانٹ بتلاتا "اگر تم اس چکر میں ہو کہ تم بھی پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی کی طرح بھاگ کر دین کے بلیٹڈ جاؤ گے تو تم غلطی پر ہو۔ ڈاکٹر آفتاب رائے۔ تمہارا تو ہم مارتے مارتے حلیہ ٹھیک کر دیں گے ———" مہی پال اضافہ کرتا)

جون پور آکر وہ بھیم کو دیکھتے کہ تندہی سے کچالو کھا رہی ہے۔ کتھک سیکھ رہی ہے

چل بھرتے چلی ری گوئیاں آن آن گاتی پھر رہی ہے۔ یہ بھی کنول کماری کی قوم سے ہے۔
"اری او باؤلی ـــــ بتا تو کیا کرنے والی ہے ـــــ" وہ سوال کرتے ـــــ
"پتہ نہیں ماما ـــــ" وہ معصومیت سے جواب دیتی۔
پتہ نہیں کی بچی ـــــ وہ دل میں کہتے۔

چھت کی منڈیر پر ٹہلتے ٹہلتے آفتاب رائے نیم کی ڈالیوں کے نیچے آ گئے۔ سامنے بہت دور، سول لائنز کے درختوں میں چھپی ہوئی حاکم ضلع کی کوٹھی میں گیس کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پروائی ہوا بہے جا رہی تھی۔ یہ چاندرات تھی اور مسلمانوں کے محلّوں کی طرف سے محرّم کے نقاروں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

محرّم آ گیا ـــــ آفتاب رائے کو خیال آیا ـــــ شاید اب کے سے پھر سر پھٹوّل ہو۔ بہت دنوں سے نہیں ہوئی تھی انہوں نے سوچا۔

ویسے انگریز کی پالیسی یہ تھی کہ جن ضلعوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں ہندو افسروں کو تعینات کیا جاتا تھا اور جہاں ہندو زیادہ ہوتے تھے۔ وہاں مسلمان حاکموں کو بھیجا جاتا تھا تاکہ توازن قائم رہے۔ یہ دوسری بات تھی کہ صوبے کی چھ کروڑ آبادی کا صرف ۱۴ فیصدی حصہ مسلمان تھے۔ لیکن اتنی شدید اقلیت میں ہونے کے باوجود تہذیبی اور سماجی طور پر مسلمان ہی سارے صوبے پر چھائے ہوئے تھے جون پور، لکھنؤ، آگرہ، علی گڑھ، بریلی، مراد آباد، شاہجہان پور وغیرہ جیسے ضلعوں میں تو مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن باقی کے سارے خطّوں میں بھی ان کا بول بالا تھا۔ صوبے کی تہذیب سے مراد وہ کلچر تھا جس پر مسلمانوں کا رنگ غالب تھا۔ گلی گلی، محلے محلے، گاؤں گاؤں سینکڑوں، ہزاروں مسجدیں اور امام باڑے تھے۔ مکتب، مدرسے، درگاہیں، قلعے، حویلیاں چپے چپے سے مسلمانوں کی آٹھ سو سال پرانی روایات وابستہ تھیں۔

ہندو مسلمانوں میں سماجی سطح پر کوئی واضح فرق نہ تھا۔ خصوصاً دیہاتوں اور قصبہ جات میں عورتیں نہ زیادہ تر ساڑھیاں اور ڈھیلے پائجامے پہنتیں۔ اودھ کے بہت سے پرانے

خاندانوں میں بیگمات اب تک انگنے بھی پہنتیں۔ بن بیاہی لڑکیاں ہندو اور مسلمان دونوں ساری کے بجائے کھڑے پائنچوں کا پائجامہ پہنتیں۔ ہندوؤں کے یہاں اسے "اجار" کہا جاتا۔ مشغلوں کی تقسیم بڑی دلچسپ تھی۔ پولس کا عملہ اسی فیصدی مسلمان تھا۔ محکمہ تعلیم میں ان کی اتنی ہی کمی تھی۔ تجارت تو خیر کبھی مسلمان بھائی نے ڈھنگ سے کر کے نہ دی۔ چند پیشے مگر خاص مسلمانوں کے تھے۔ جن کے دم سے صوبے کی مشہور صنعتیں قائم تھیں۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے کچھ ایسا مضبوط نظام تھا کہ سارا منافع تو بازار تک پہنچاتے پہنچاتے مڈل مین ہی مار لے جاتا تھا اور جو بھائی کے پاس بچتا تھا۔ اس میں قرضے چکانے تھے۔ بٹیا کا جہیز بنانا تھا اور ہزاروں قصے تھے آپ جانئے۔

زبان اور محاورے ایک ہی تھے مسلمان بچے برسات کی دعا مانگنے کے لئے منہ نیلا پیلا کئے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے اور چلاتے ——— برسو رام دھڑاکے سے بڑھیا مر گئی فاقے سے۔ کرشن کنہیا کی بارات نکلتی تو وظیفہ کیا جاتا ——— ہاتھی گھوڑا پالکی ——— جے کنہیا لال کی۔ مسلمان پردہ دار عورتیں جنہوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی۔ رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو لہک لہک کر الاپتیں ——— بھری گگری موری ڈھرکائی شام۔ کرشن کنہیا کے اس تصور سے ان لوگوں کے اسلام پر کوئی حرف نہ آتا تھا۔ یہ گیت اور لچریاں اور خیال، یہ محاورے، یہ زبان، ان سب کی بڑی پیاری اور دلآویز مشترکہ میراث تھی۔ یہ معاشرہ جس کا دائرہ مرزاپور اور جون پور سے لے کر لکھنؤ اور دلّی تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک مکمل اور واضح تصویر تھا۔ جس میں آٹھ سو سال کے تہذیبی ارتقاء نے بڑے گمبھیر اور بڑے خوبصورت رنگ بھرے تھے۔

ڈاکٹر آفتاب رائے نے (کہ ان کا نام ہی اس مشترکہ تمدن کی لطافت کا ایک مظہر تھا) ایک بار سوچا تھا کہ وہ کبھی ایک کتاب لکھیں گے کہ کس طرح پندرھویں صدی میں بھگتی تحریک کے ذریعے ——— لیکن ذہن کو مکمل سکون کہاں میسّر تھا۔ پہلے یہ کنول کماری کو پڑی۔ پھر ان کی معاشی مجبوریاں آڑے آئیں اور ان کو ولایت سے لوٹ کر بنارس میں لیکچررشپ سنبھالنی پڑی۔ جہاں دن رات ہندی اتھوا ہندوستانی کے گن گائے جاتے ———

بہ میں تم سے کہتا ہوں ـــــــ کہ شدھ ہندی اور گئو رکھشا اور رام راجیہ یہ سب سے بڑا خطرہ ہے اس خطرے سے بچو۔ انہوں نے ایک دفعہ ایک کانفرنس کے پنڈال میں چلّا کر کہا تھا ـــــــ آفتاب رائے کے ساتھی مذاق میں انہیں جون پور کا قاضی کہا کرتے تھے " یہ جو کتاب تم لکھنے والے ہو اس کا نام رکھنا ـــــــ " جون پور کا قاضی ـــ ـــ " عرف " بیں شہر کے اندیشے میں دبلا کیوں ہوا ـــــــ ! "

رات کی ہوا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ نیم کے پتے بڑے پُر اسرار طریقے سے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ہاں زندگی میں بے پایاں اُداسی تھی اور ویرانہ اور تاریکی۔

محلے کے مکانوں میں مدھم روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ نیچے بڑی بھاوج کے مکان کے بڑے آنگن میں مجلس کے لئے جو گیس کا ہنڈہ نصب کیا گیا تھا اس کی روشنی رات کے ویرانے میں بڑی لرزہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ جیسے مہوے کے جنگل میں اگیا بیتال اور ماں چپکے چپکے روتے ہوں۔

مجلسوں کے گریہ و بکا کی مدھم آوازیں پروائی کے جھونکوں میں رل مل کر وقفے وقفے کے بعد یک لخت بلند ہو جاتی تھیں۔ نکڑ پر کنور رنجن داس کے ہاں کی محرّم کی سبیل کے پاس رکھی ہوئی نوبت یکسانیت سے بجے جا رہی تھی۔

۴

" عاشور کی شب لیلیٰ ادے سرہانے شمع رکھ کر ـــــــ " لوٗ اُتدن نے تکیہ پر کرم خوردہ کتاب رکھ کر پڑھنا شروع کیا ـــــــ

" ـــــــ اے نکتی رہیں چہرہ علی اکبر کا ـــــــ " بگن نے باریک تیز آواز میں ساتھ دینا شروع کیا۔

" اے لو دونوں کی دونوں سٹھیا گئی ہیں ـــــــ اے بیوی چاند رات کو نویں تاریخ کے مرثیے نکال کر بیٹھ گئیں ـــــــ !؟ " بڑی بھاوج نے باورچی خانے میں سے پکارا۔

"توبہ توبہ... کمبخت ایسی ساڑستی پڑی ہے کہ اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا ـــــ
اے لو ہیں تو عینک لانا ہی بھول گئی۔ اب مجھے کچھ سجھائی تھوڑی دے رہا تھا ـــــ میں
نے تو اٹکل سے پڑھنا شروع کر دیا ـــــ اے بہن ـــــ اے نیازی بیگم ـــــ ذری اپنی
عینک تو دینا ـــــ" بوا مدن نے طویل سانس بھر کے کہا۔

نیازی بیگم نے اپنی عینک اتار کے دی جو بوا مدن نے ناک کی پھننگ پہ رکھ کر پھر
سے بیاض کی ورق گردانی شروع کی۔

"اے بوا مدن نجم الملت کی بیاض بھی لائی ہو کہ نہیں ـــــ؟" بڑی بھاوج نے
تخت کے پائے کے قریب آکر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"لڑکیوں سے پوچھئے ـــــ بڑی بھاوج ـــــ نجم الملت کے نوحے تو یہی لوگ
پڑھت ہیں ـــــ" بگن نے جواب دیا۔

"ہاں بٹیا ہم تو پرانے فیشن کے آدمی ہیں۔ اب تو نوحوں میں بھی نئے راگ رنگ نکلے ہیں"
بوا مدن نے قدرے بے نیازی سے اضافہ کیا۔

لڑکیوں پر صفا چوٹ تھی بوا مدن نے لڑکیوں کی نوحہ خوانی کو کبھی بھی بنظر استحسان
نہ دیکھا۔

کنبے اور محلے کی ساری لڑکیاں دیوار کے سہارے بڑے اسٹائل سے سیاہ جارجٹ
کے دوپٹوں سے سر ڈھانپے خاموش بیٹھی تھیں۔ بوا مدن کے اس طعنے کا انہوں نے ہرگز
نوٹس نہیں لیا۔

"ڈولی اترو الو ـــــ" باہر سے رام بھروسے کی آواز آئی۔

"پردہ کر لو لوگو ـــــ کہار اندر آتے ہیں ـــــ"

فیر بنی کی بعینی دھم سے گھڑونچی پر ٹکا کر مولہ تیز آوازیں چلائی ـــــ "چھمو بیگم
آگئیں۔"

چھمو بیگم ڈولی میں سے اتریں اور پائینچے سیمنٹ کے پانی سے لبریز نالی کو الانگنے کے
ارادے سے آگے بڑھیں ما اللہ رکھے بڑی بھاوج کے ہاں تو ہر وقت بس بہیا سی آئی رہتی

ہے۔" انہوں نے ذرا بیزاری سے کہا۔

کہیں ممولہ نے یہ سن لیا "اے چھمو بیگم ـــــ ذری زبان سنبھال کے بات کیا کیجئے بڑی بھاوج کے دشمنوں کے گھر بہتیا آوے۔ شیطان کے کان بہرے ـــــ ایسا تو ہیں نے آنگن کا سارا پانی سونتا ہے۔ اپنے ہاں نہیں دیکھتیں۔ ساری گلی کوسے کے نوبت رائے کا تلاؤ بنا رکھا ہے۔ اِتّا اِتّا پانی آپ کے گھر میں کھڑا رہتا ہے ہاں۔" اس نے منہ در منہ جواب دیا۔

" اے بی ممولہ ـــــ ذری آپے میں رہنا ـــــ میں خود سے نہیں آگئی۔ بڑی بھاوج نے سو دفعہ بلایا کہ آکر مجلس پڑھ جاؤ ـــــ مجلس پڑھ جاؤ ـــــ میں اپنے گھر سے فالتو نہیں ہوں کہ ماری ماری پھروں اور ٹکے کی ڈومنیوں کی باتیں سنوں۔ ہاں۔ لو بھائی ڈولی واپس کرو ـــــ" چھمو بیگم نے بیچ آنگن کے کھڑے ہو کر رجز پڑھا۔

بڑی بھاوج جلدی سے اُٹھ کر باہر آئیں ـــــ "اے ہے ـــــ یہ کیا کوانو چن مچی ہے۔ ماموں پر مصیبت کی گھڑی آن پہنچی اور تم ہو کہ کھڑی جھگڑ رہی ہو ـــــ چل نکل ممولہ یہاں سے ـــــ ڈوبی جب دیکھو تب ہی فضیحتا شروع کرتی ہے ـــــ آؤ چھمو بیگم جم جم آؤ ـــــ "

ڈیوڑھی میں کہاروں نے زور سے ڈنڈا بجایا۔ اجی پیسے تو بھجوائیے بیگم صاحب ـــــ

ارے دیّا رے ـــــ ساری دیہہ دُکھن لاگت ہے ـــــ رام بھروسے نے دیوار سے لگ کر ماتا دین کی بیڑی سلگاتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔ ویسے محرم کی وجہ سے اب پیسے خوب ملیں گے۔ چہلم تک دس دس پھیرے ایک گلی کے ہوتے تھے اور ہر پھیرا تین تین پیسے۔ دُور کے محلّوں تک آنے جانے کے تو دو دو آنے تک ہو جاتے تھے۔ بس چاندی تھی آج کل بھائی رام بھروسے اور ان کی برادری کی اور رِبڑوے جو چل رہے تھے وہ الگ۔ ربڑوہ ایک طرح کا لکڑی کا کمرہ نما کھٹولہ ہوتا تھا جس میں چاروں طرف پردہ باندھ دیا جاتا تھا۔ اندر دو دو تین تین سواریاں، گھس پٹ کر بیٹھ جاتی تھیں اور بچوں کی انگریزی پرام کی طرح پیچھے سے ڈھکیلا جاتا تھا اور چرخ چوں کرتا ربڑوہ گلیوں کے پتھریلے فرش پر بڑے ٹھاٹھ سے چلتا۔ پالکی کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔ یعنی چھ آنے فی پھیرا۔ پرائیویٹ پالکی جو پہلہ

صدرِ اعلیٰ کے یہاں تھا۔

چھمّو بیگم اس معرکے کے بعد ٹھمک ٹھمک چلتی آن کر چاندنی پر بیٹھ گئیں اور عینک لگا کر بڑے ٹھسّے سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ بُوا اُمّدّن خود بڑی ہائی برو سوز خواں تھیں۔ انہوں نے کبھی چھمّو بیگم کی پرواہ نہ کی۔

سوز ختم ہو چکا تھا۔ گوٹے کے جھنکے لگاتی بُوا اُمّدّن طمانیت سے جا کر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ چٹاپٹی کی گوٹ کا اودا پاجامہ اور توتے کے پر جیسے ہرے رنگ کا دوپٹہ اوڑھے وہ اس شان سے دیوار سے لگ کر بیٹھتی تھیں کہ دور سے معلوم ہو جاتا تھا کہ ہاں یہ رام پور کی میر یاسن ہیں۔ مذاق نہیں ہے۔

چھمّو بیگم ایک تو یہ کہ سیّدانی تھیں، دوسرے یہ کہ بگّن سلمہا کے بیاہ کے سلسلے میں ان سے جنگ ہو چکی تھی۔ لہٰذا وہ بُوا اُمّدّن کو ہرگز خاطر میں نہ لاتیں۔ بُوا اُمّدّن کو اگر یہ زُعم تھا کہ مالکوس اور سوہنی اور بھاگ میں سوز ایسے پڑھتی ہیں کہ مجلس میں پٹّس پڑ جاتی ہے۔ تو چھمّو بیگم کو بھی اپنے اوپر ناز بے جا نہ تھا کہ آٹھویں تاریخ والا میر انیسؔ کا مرثیہ پوری راگ داری کے ساتھ ان جیسا کوئی اور نہ پڑھ سکتا تھا۔

چھمّو بیگم نے تہ در تہ ریشمی غلافوں میں سے چاند رات کا بیان نکالا اور مجمع کو نہایت گھور کر دیکھا۔

لڑکیوں کا گروہ اپنی جگہ پر ذرا چوکنّا ہو گیا۔ ان لڑکیوں پر فرض تھا کہ جب چھمّو بیگم حدیث پڑھیں یا وعظ کریں تو یہ لوگ دوپٹے منہ میں ٹھونس کر کھِل کھِل ہنسیں پر بظاہر یہی معلوم ہوتا کہ زار و قطار رو رہی ہیں اور چھمّو بیگم کس قیامت کی حدیث پڑھتی تھیں کہ کہرام بپا ہو جاتا تھا۔

چھمّو بیگم کے وعظ بہت موڈرن ہوتے تھے۔ کیا جناب کبّن صاحب بلکہ خود قبلہ جارجوی صاحب ایسے ایسے رموز و نکات۔ انگریزی فلسفے کے واقعہ شہادت میں سے نہ نکال سکتے۔ جو چھمّو بیگم پل کی پل میں دریا کوزے میں بند کر کے رکھ دیتی تھیں۔

"اے صاحبانِ مجلس ——— جب باری تعالےٰ نے اپنے نور کے دو حصّے کیے"———

والی تمہید سے لے کر جب وہ اس کلائیمکس تک پہنچتی تھیں کہ "اے بیبیو ـــــ جناب، عباسؑ نے رو کر کہا بالی سکینہ اٹھو ـــــ" تو اس وقت مجلس میں نالہ و شیون سے قیامت بپا ہو چکی ہوتی تھی۔ اندر باہر سب کہتے تھے کہ ماشااللہ سے چھمّو بیگم نے سماں باندھ دیا ان کے زورِ خطابت کا یہ عالم تھا کہ منٹوں میں بات کہیں سے کہیں پہنچتی تھی۔ ابھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کا بیان ہو رہا ہے۔ ابھی یزید ملعون کے خاندان کا ذکر آ گیا۔ جنگِ جمل کا واقعہ سنا رہی ہیں۔ ساتھ ساتھ اُس کا موازنہ جرمن اور انگریز کی لڑائی سے بھی ہوتا جاتا ہے رسالت مآبؐ کے بیان پر جب آتیں تو کہتیں ـــــ "بیبیو ـــــ میں کوئی مؤرخ، کوئی تاریخ دان کوئی فلاسفہ نہیں ہوں۔ مگر اتنا جانتی ہوں اور کہے دیتی ہوں کہ ایک طرف عیسائیوں اور رومیوں کی دس لاکھ فوج تھی۔ ایک طرف جناب رسالت مآبؐ کے ساتھ صرف پندرہ آدمی تھے مگر وہ گھمسان کا رن پڑا تھا کہ سارے فرشتے چرخِ اوّل پر اُتر آئے تھے اور نُور کی جھاڑو سے رسالت مآبؐ کے لئے راستہ صاف کرتے جاتے تھے۔"

خداوند تعالےٰ کے مسئلہ پر فرماتیں ـــــ "اے بیبیو ـــــ یہ جو انگریزی داں دہریے خدا کے منکر ہیں۔ ان کا احوال مجھ سے سنو اور کان کھول کر سنو ـــــ کہ خداوند کریم ان سب شیطانی وسوسوں اور چالوں سے واقف ہے جو فرنگیوں کے علم کے ذریعے ابلیس ملعون نے تم مسلمانوں کے دلوں میں ڈال دی ہیں۔ بلکہ میں تم کو آج یہ بتانا چاہتی ہوں۔ اے مومنہ بیبیو ـــــ کہ قرآن حکیم کے اندر اللہ تعالےٰ نے خود انگریزی میں اپنی توحید کا ثبوت دیا ہے۔ فرماتا ہے وہ ربِ ذوالجلال کہ قُلْ ہُوَ اللّٰہُ اَحَد۔ اَللّٰہُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ـــــ یہ وَن کیا ہے ـــــ؟ وَن انگریزی میں ایک کو کہتے ہیں ـــــ مسئلہ توحید سے سلسلہ کھینچ کر پھر واقعہ کربلا اور شہادتِ علی اکبرؑ سے ملا دیا جاتا۔ یہ چھمّو بیگم کے آرٹ کا کمال تھا۔

بڑی بھاوج کیا سارے محلّے کو معلوم تھا کہ چھمّو بیگم خاصی فراڈ ہیں۔ لیکن ان کی شمولیت کے بغیر مجلس میں جان ہی نہ پڑ سکتی تھی۔ لہٰذا ان کی بدمزاجی کو بھی برداشت کیا جاتا۔

برسوں سے جب سے بڑی بھاوج پیدا ہوئیں، بڑی ہوئیں، رخصت ہوکر بارہ بنکی سے جون پور آئیں۔ زندگی کا ایک چلن قائم تھا۔ جس میں شادی بیاہ، تیج تہوار، لڑائی جھگڑے ختم، کونڈے، جوگی رم پورے کی سالانہ زیارت، غرض کہ ہر چیز کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم تھی ڈپٹی جعفر عباس سے بڑی دھوم دھام سے ان کا بیاہ رچایا گیا تھا۔ جب وہ پندرہ سال کی تھیں۔ کیا زمانے تھے۔ دو فرلانگ لمبا تو ماہی مراتب ہی تھا۔ براتیوں کو چاندی کی طشتریوں میں سندیلے کے لڈو بانٹے گئے تھے اور جنایتوں یعنی لڑکی کے گاؤں والوں کے یہاں ہفتوں مہینوں پہلے سے ڈھولک رکھ دی گئی تھی۔ ان کا میکہ و سسرال دونوں طرف سے ماشاءاللہ سے بھرا پُرا کنبہ تھا۔ بس ایک چھوٹی اماں ہی سے ان کی نہ بنی۔ دیورانی جیٹھانی کا دیوار بیچ گھر تھا۔ لیکن مدتوں کھڑکی میں تالا پڑا رہا۔ مقدمہ کا قصّہ دراصل امام باڑے والے آموں کے باغ سے چلا تھا بعد میں رفتہ رفتہ دونوں بھائیوں کے گھرانوں میں بول چال تک بند ہوگئی۔ سچ کہا ہے کہ بُوا کہ زر، زمین، زن تین چیزیں گھر کا گھر واکر دیتی ہیں۔ سگے بھائی غیر ہو جاتے ہیں۔ پر جب چھوٹی اماں بیمار پڑیں تو بڑی بھاوج نے وضع داری پر حرف نہ آنے دیا اور مرنے سے پہلے دیورانی نے ساری اگلی پچھلی شکایتوں کو بھول کر کہا سنا معاف کروالیا۔ اس پر بھی کہنے والوں کا بہن منہ کس نے بند کیا ہے محلّے میں اُڑ گئی کہ یہ چھوٹی اماں اپنے غلّے کی کوٹھڑی میں سونے کی مہریں دفن کئے بیٹھی تھیں۔ یہ ان کو حاصل کرنے کی ترکیبیں تھیں۔ پوچھو بڑی بھاوج کے پاس خدا کا دیا خود کیا کچھ نہیں۔ جو وہ ایسے کمینے خیالات دل میں لاتیں اور اصلیت یہ ہے کہ چھوٹی اماں کی وہ سونے کی مہروں والی جھجھری جس پر وہ عمر بھر مایا کا سانپ بنی بیٹھی رہیں۔ اوت کے مال سے بھی بدتر ثابت ہوئی۔ لڑکوں نے کہ سارا پیسہ دو سال کے اندر اڑا دیا۔ بلکہ بُوا مُدّن تو یقین محکم کے ساتھ کہتی تھیں کہ چھوٹی اماں اور بڑی بھاوج کی لڑائی کروانے میں زیادہ ہاتھ چھمّو بیگم کا ہے۔ حرّافہ اِدھر کی اُدھر لگاتی تھی اور پھر سال کے سال منبر پہ مولون بن کر چڑھ بیٹھتی ہے چڑیل۔

رونا بہرحال فرض تھا خواہ چھمّو بیگم جیسی کٹنی ہی بیان کیوں نہ پڑھے۔ لہٰذا بُوا مُدّن

دیوار کے سہارے بیٹھی بڑے مشہدی رومال سے منہ ڈھانپے شائستگی سے سسکیاں بھرتی رہیں۔ لڑکیاں دہلیز پر بیٹھی بیٹھی اونگھ رہی تھیں اور منتظر تھیں کہ کب حدیث ختم ہو اور نوحہ خوانی کی باری آئے۔

نوحے پڑھنے میں بڑی بھاوج کی لڑکی کشوری کو ملکہ حاصل تھا۔ ماتھ آئے تھے کیا کیا گلِ زہرا کو فدائی ــــ نو ماؤں نے دیکھی درِ خیمہ سے لڑائی ــــ ارے لڑتے ہوئے گرتے ہوئے مرتے ہوئے دیکھا ــــ اور جانے کون کون سے سارے جدید نوحے جی ہاں۔ ایسی پاٹ دار آواز میں آخری بند اٹھاتی کہ بھیم کے گھر تک آواز پہنچ جاتی تھی۔

نوحوں کی طرزیں نکالنا لڑکیوں کا خاص مشغلہ تھا۔ جہاں کوئی چلتا چلتا لیکن غمگین سی دھن کا گیت ریکارڈ پر سنا جھٹ ذرا سی تبدیلی کر کے نجم الملت کے کسی نوحے پر اس دھن کو چپکا دیا۔ طلعت آرا اس معاملے میں بڑی رجعت پسند واقع ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بھئی یہ غلط بات ہے۔ یہ کیا ساتویں کی رات کو معلوم ہو کہ کانن بالا کا ریکارڈ بج رہا ہے۔ توبہ توبہ مگر کشوری کس کی سنتی تھی۔ ویسے بھی وہ بڑی آزاد خیال روشن دماغ انسان تھی۔ ہائی اسکول تو اس نے پاس کر لیا تھا۔ وہ تو لکھنو جا کر لگے ہاتھوں انٹر اور بی۔ اے بھی کر لے۔ لیکن چھوٹی اماں جب مرتے وقت بڑی بھاوج سے صلح صفائی کرنے پڑیں تو یہاں تک طے کر گئیں کہ ان کے بڑے لڑکے میاں اعزاز سے اس کا بیاہ بھی کر دیا جائے۔

اب یہاں سے مسلم سوشل پکچر بننا شروع ہوئی۔ کشوری کہاں ایک تیز لڑکی۔ سارے ٹلنگ کے نمونے اس کو آویں۔ یہاں پر وہ باغ میں کوئی نیا نمونہ سویٹر کا کسی کو پہنے دیکھ پاوے گھر آ کر فوراً تیار۔ افسانے پڑھنے کی وہ شوقین۔ فیاض علی کی انور و شمیم سے لے کر کرشن چندر کی "نظارے" اور حجاب امتیاز علی کی "ظالم محبت" تک اس کی الماری میں موجود سینما بھی جب موقع ملتا ضرور دیکھ لیتی۔ میاں اعزاز ایک تو یہ کہ خاصے مولوی آدمی تھے۔ پی۔ سی۔ ایس میں آ گئے تھے۔ کیننگ کالج سے ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے روادار نہیں تھے کہ گھر کی لڑکیاں ذرا کی ذرا نمائش ہی میں ہو آئیں۔ خود بڑی دوُن کی لیتے تھے کہ مس سکینہ سے یونین میں یوں بحث چلی اور مس صدیقی کے یوں چار پر گیا۔ لیکن اپنے

اپنے کنبے کی لڑکیوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں جہاں گھر سے باہر نکلیں۔ میاں زمانہ خراب ہے کسی کو بدنام ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔

بڑی بھاوج نے، لطیفہ یہ تھا کہ کشوری کے لئے بڑی منتیں مرادیں مان رکھی تھیں۔ عاشورہ کے روز جب ذوالجناح اندر لایا جاتا تو جلیبی کھلانے کے بعد اس کے کان سے منہ لگا کہ ساری بیبیاں اور ساری لونڈی باندیاں دعا مانگتیں کہ یا مولا کشوری بٹیا کا نصیبہ اب کے سال کھلے ——

اب یہ پوچھو کہ یہ میاں اعزاز کے پلے باندھنا نصیبے کا کھلنا سمجھا جا رہا تھا۔ لیکن کشوری نے بھی طے کر لیا تھا کہ عین بیاہ کے موقع پہ وہ انکار کر دے گی۔ برات میں ایک ہڑبونگ مچ جائے گی۔ وہ جیسا کہ سوشل فلموں میں ہوتا ہے کہ عین وقت پر جب پھیرے پڑنے والے ہوں تو اصل ہیرو ہسپتال یا جیل سے چھوٹ کر پہنچ جاتا ہے اور گرج کر کہتا ہے۔ ٹھہر جاؤ یہ شادی نہیں ہو سکتی ——

۵

کشوری کے بابا سید جعفر عباس ڈپٹی کلکٹر تھے۔ لیکن دل کے بڑے پکے قوم پرست مسلمان تھے۔ جب کانگریسی وزارت قائم ہوئی تو آپ نے بھی خوب خوب خوشیاں منائیں حافظ ابراہیم ضلع میں آئے تو آپ مارے محبت کے جا کے ان سے لپٹ گئے۔ جب جنگ چھڑی اور کانگریسی وزارت نے استعفا دیا اور مسلم لیگ نے یوم نجات منایا تو کشوری کے بابا کو بڑا دکھ ہوا۔ اب وہ ریٹائر ہو چکے تھے اور چبوترے پر بیٹھے پیچوان لگائے سوچا کرتے کہ دنیا ہی بدلتی جا رہی ہے۔ لڑکے جن کو نوکری نہ ملتی تھی۔ اب فوج میں چلے جا رہے تھے اپنا اصغر عباس ہی اب لیفٹیننٹ تھا۔ مہنگائی شدید تھی لیڈر جیل میں تھے۔ لیکن زندگی میں یک بیک ایک نیا رنگ آ گیا تھا۔ حافظ ابراہیم کے موقع پر ضلع کے اردو اخباروں نے لکھا تھا: —— کہاں گئی موٹر سرکاری بیچا کہ سبزی ترکاری، وہ بھی دیکھا، یہ بھی دیکھ —— کشوری کے بابا کو یہ سب پڑھ اور سن کر صدمہ ہوتا۔ وہ بڑے پکے مسلمان تھے۔ دراصل

مسلمانوں کے معاشرے کا استحکام انہیں پرانے مدرسہ فکر کے ڈپٹی کلکٹروں کے دم قدم سے قائم تھا۔ پردے کے بڑے پابند۔ کیا مجال جو لڑکیاں بغیر قناتوں چادروں کے گھر سے قدم نکالیں (صوبے کے مشرقی ضلعوں میں یہ قصے کا رواج نہ تھا) "باعزت متوسط طبقے" کی مسلمان اور ہندو عورتیں چادریں اور دلائیاں اوڑھ کر باہر نکلتی تھیں۔ ہندو عورتیں تو خیر گھونگھٹ کاڑھ کر سڑک پر سے گزر جاتی تھیں۔ لیکن مسلمان بیبیوں کا دن دہاڑے باہر نکلنا سخت معیوب خیال کیا جاتا تھا۔

اصغر عباس فوج میں رہ کر بالکل انگریز بنتا جا رہا تھا۔ اب کے سے جب وہ چھٹی پر گھر آیا تو چند شرائط بابا کے سامنے رکھیں۔

(ا) وہ خود کنبے میں بیاہ نہ کرے گا۔

(ب) کشوری جب اس کے ساتھ رہنے کے لئے جبل پور جائے گی تو پردہ نہ کرے گی۔

(ج) اعزاز میاں سے بیاہ کا پروگرام منسوخ۔

(د) کشوری کو الیف۔اے کے لئے مسلم گرلز کالج لکھنؤ بھیجا جائے گا۔

بڑے بحث مباحثے کے بعد بابا اور بڑی بھاوج دونوں نے ان شرائط کے بیشتر نکات منظور کر لئے۔

ہندوستان کے مسلمان متوسط طبقے کا کوئی ہی خاندان ایسا ہوگا جس کی لڑکیوں نے کبھی نہ کبھی علی گڑھ گرلز کالج یا لکھنؤ مسلم اسکول میں نہ پڑھا ہو۔ بیشتر لڑکیوں کو اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ انہوں نے چاہے چند روز ہی کے لئے کیوں نہیں، لیکن پڑھا مسلم اسکول میں ہے۔

بعینہ یہی احوال مہیلا ودیالہ لکھنؤ کا تھا۔ صوبے کے سارے ٹھوس ہندو متوسط طبقے کی بیٹریاں اس دش وشٹیالے کی ودیارتھی رہ چکی تھیں۔ سرکاری اور عیسائی اداروں کا ماحول مختلف تھا۔ وہاں انگریز کے اقبال کی وجہ سے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔

اب کی جولائی میں کھیم اور کشوری اکٹھی ہی جون پور سے ٹرین میں سوار ہوئیں اور لکھنؤ آن پہنچیں۔ چار باغ پر ماما کھیم کو اتروانے کے لئے آ گئے تھے اور کشوری کو پہنچانے کے لئے

تو ناجد بھائی بچارے مردانہ ڈبّے میں موجود ہی تھے۔ اسٹیشن کی برساتی میں پہنچ کر کھیم اور کشوری نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور روتیں اور کبھی کبھی ملنے کی کوشش کرنے کا وعدہ کیا اور تانگوں میں بیٹھ کر اپنی اپنی راہ چلی گئیں۔

۶

"رکھیم دتی رائے زادہ سے میری ملاقات اتنے برسوں بعد بینٹ ہال کی سیڑھیوں پر ہوئی۔ وہ چودھری سلطان کے لیکچر کے اوپر جا رہی تھی۔ میں احتشام صاحب کی کلاس کے بعد پرشین سے اتر رہی تھی ـــــــ" کشوری نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ـــــ اور پھر وہ خاموش ہوگئی ـــــــ اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ جہاں برف کے گالے چپکے چپکے نیچے گر رہے تھے ـــــــ

"کیا تم نے کبھی سوچا ہے،" اس نے ساتھیوں کو مخاطب کیا ـــــــ "کہ ہم جو چھ سو سال ایک دیوار کے سائے میں رہے، ایک مٹی سے ہماری اور اس کی تخلیق ہوئی تھی۔ اس کے اور ہمارے گھر والوں کو اپنی مشترکہ کلچر پر ناز تھا ـــــــ چار سال بعد جب اس وقت کھیم نے مجھے دیکھا تو ایک لحظے کے لئے ذرا جھجکی پھر "ہیلو کشوری،" کہتی ہوئی آگے چلی گئی۔

"اور میں نے سوچا ٹھیک ہے۔ میں نے اور اس نے اسی دن کے لئے ساری تیاریاں کی تھیں۔ وہ مہیلا ودیالہ کی لڑکی ہے۔ کانگریس میں یقین رکھتی ہے میرے بابا بڑے نیشنلسٹ بنتے تھے لیکن میں کٹّر مسلم لیگی ہوں۔ یوم پاکستان کے جلسے کے موقع پر کھیم کے ساتھیوں نے ہمارے اوپر اینٹیں پھینکی تھیں۔ اکھنڈ ہندوستان ویک کے دنوں میں ہمارے رفقاء نے ان کے پنڈال پر پکٹنگ کی تھی۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہی ٹھیک ہے اور بھائی زندگی نہ ہوتی شانتا رام کی فلم ہوگئی۔ بنو اچھے پڑوسی کہ وبھائی چارہ نہیں کرتے ـ بھائی چارہ میاں زبردستی ہے تمہاری ایک مثال میری اور کھیم کی دیکھ لو۔ جنم جنم کے پڑوسی تھے اور کیا دوستی اور یگانگت کا عالم تھا۔ یہ تھے ہم ان کے لئے ملیچھ۔ ان کے

وکے کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے اور ہماری اماں کا یہ سلسلہ تھا کہ اگر ہندو کی دکان سے کوئی چیز آئی تو اسے فوراً حوض میں غوطہ دے کہ پاک کیا جاتا تھا ایک قوم اس طرح بنتی ہے؟ تقسیم کا مطالبہ ہند کی ساری تاریخ کا نہایت فطری اور نہایت منطقی نتیجہ ہے ــــ،، کشوری چپ ہو گئی۔

آتش دان میں آگ لہک رہی تھی۔ کسی نے آہستہ سے ایک انگارہ الاؤ میں سے نکال کر باہر گرا دیا۔ جہاں وہ چند لمحوں تک سلگتا رہا اور پھر بجھ گیا۔ نیچے سڑک پر کوئی بھکاری اکارڈین پر "موجوں کے اوپر" کا والز بجاتا ہوا گزر رہا تھا۔

"آج میں کنول کماری کے ہاں چا پر گئی تھی،، ارملا نے کہا "وہاں بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ان سب سے میں نے کہا کہ ہمارے "مجلس میلے،، کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔"

"کنول کماری ہــــ کشوری نے کچھ یاد کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں۔ ہمارے نئے فرسٹ سیکریٹری کی بیوی اور میں نے سوچا کہ قابل عورت ہے۔ اس سے میلے کے موقع پر ہندوستانی آرٹ پر لگے ہاتھوں ایک تقریر بھی کروالیں پام دت وغیرہ سب ہی ہوں گے بیچاری نے وعدہ کر لیا ــــ،،

"سوریہ است ہو گیا ــــ سوریہ است ہو گیا ــــ دوسرے کمرے میں "میلے" کے پروگرام کی ریہرسل کرتے ہوئے چند لڑکیوں نے ہر نند رناتھ چٹوپادھیا کا کورس یک لخت زور زور سے الاپنا شروع کر دیا۔

"ــــ میں نے بہت کوشش کر کے سوچا کہ میں جب یونیورسٹی میں اور لوگوں سے ملتی ہوں ــــ اٹلی کے لوگ ہیں۔ برازیل کے۔ عراق اور مصر کے۔ میں ان سے اس طرح کیوں نہیں باتیں کرنا چاہتی۔ پھر ہمارے پروفیسر ہیں "ہم عصر فنون کی انجمن،، کے اراکین ہیں۔ انہوں نے ہمارے مسائل پر بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ ہمارا بڑا دقیق مطالعہ کیا ہے۔ اخباروں میں وہ ہمارے متعلق اڈیٹوریل لکھتے ہیں۔ دارالعوام میں اور ریڈیو پر بحثیں کرتے ہیں۔" کشوری نے کہا۔

"چاروں اور آگ تھی ——— دل میں بھوک پیاس جگی ——— پگ پگ ہم گاتے ——— ہم گاتے ہم گاتے ———" لڑکیاں چلا رہی تھیں۔

"میرا جی چاہتا ہے۔ میں تم سے یہ سب باتیں کہوں۔ تم کو یہ سارا قصہ یہ سارا گورکھ دھندا سمجھاؤں ———" اُس نے ساتھیوں کو اداس آواز میں مخاطب کیا ——— تاکہ تم لوگ مجھے بھی ایک اور مضحکہ خیز کردار نہ سمجھو اور اس سارے پس منظر اس ساری کہانی کو اس فاصلے سے دیکھ کر اپنی نئی راہ کا تعین کرو۔

سڑک پر کیرل گانے والوں کی ٹولیاں گزرنی شروع ہوگئی تھیں۔

"کرسمس کا زمانہ بھی اختتام پر ہے" روزماری نے اظہارِ خیال کیا۔

ہاں۔ جون پور میں، میرٹھ میں، بچے کھچے سوگوار جہلم کے تعزیوں کے سائے میں بیٹھے اپنی قسمت کو روتے ہوں گے۔ نہیں شاید محرم کا زمانہ گزر گیا ہوگا۔ یہ اپنے کیلنڈر ریکار ہو چکے ہیں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں ——— کشوری نے دل میں کہا۔

"برف باری شدید ہوگئی ہے۔ پھر بہار آئے گی۔ کیا سارے زمانے، سارے موسم اتنے بے مصرف ہیں ———؟" روزماری نے اپنے آپ سے بات کی۔

"نہیں ———" کشوری نے کہا۔

"پگ پگ ہم گاتے چلیں ———" لڑکیوں کی آواز نے تکرار کی۔

۷

چار باغ اسٹیشن پر بھیم کو آخری بار خدا حافظ کہنے کے بعد اب کشوری کو دم لینے کی فرصت بھی کہاں تھی۔ پہلے مسلم اسکول۔ پھر چاند باغ پھر کیننگ کالج۔ زمانہ کہاں سے کہاں نکل گیا تھا ہر ہنگامے میں کشوری موجود۔ مباحثے ہو رہے ہیں۔ بیڈمنٹن ٹورنامنٹ ہیں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی مصروفیات ہیں۔ ادھر ہند وا سٹوڈنٹس فیڈریشن تھا۔ مہا سبھائی طالبات کے جلسے جلوس تھے جن میں کبھی کبھی کھیم رانی زادہ دور سے نظر آجاتی۔ طالب علموں کی دنیا اچھی خاصی سیاسی اکھاڑہ بن گئی تھی۔ گھر پر واپس جاؤ تو وہی سیاست۔ کل کی تشویش مستقبل

کی فکر یہ ملک کی تقسیم ہو گی۔نہیں ہو گی۔ہو گی۔نہیں ہو گی۔

یونیورسٹی میں لیکچرز کے دوران میں پروفیسروں سے جھڑپ ہو جاتی۔سطحی طور پر ابھی دوستی اور بھائی چارہ قائم تھا۔لیکن آخری "ستو ڈاؤن" کے لئے اسٹیج بالکل تیار تھا۔

ڈاکٹر آفتاب رائے ابھی تک ہسٹری ڈیپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ایک روز ایک لیکچر کے دوران میں ان سے بھی کچھ تکرار ہو گئی۔ ایک ہندو طالب علم نے کہا: "آزادی کا مطلب ڈاکٹر صاحب مکمل سوراج ہے۔ہند کی دھرتی کو پھر سے شدھ کرنا ہے۔ساری ان قوموں کے اثر سے آزاد ہونا ہے۔جنھوں نے باہر سے آکر حملہ کیا۔یہی تلک جی نے کہا تھا جی ہاں۔"

اس پیریڈ میں شیوا جی کے اوپر گفتگو ہو رہی تھی۔لہذا خانہ جنگی ناگزیر تھی۔شام تک ساری یونیورسٹی میں خبر پھیل گئی کہ ڈاکٹر آفتاب رائے کی کلاس میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ اگلی صبح کشوری پورا جلوس بنا کر ڈاکٹر آفتاب رائے کے دفتر میں پہنچی۔

"ڈاکٹر صاحب —" اس نے نہایت رعب داب سے کہنا شروع کیا۔

"کل جس طرح آپ نے حضرت اورنگ زیب، علیہ الرحمۃ اللہ کے متعلق اظہارِ خیال کیا اس کے لئے معافی مانگئے۔ورنہ ہم اسٹرائیک کر دیں گے۔بلکہ کر دیا ہے۔اسٹرائیک ہم نے — آپ نے ہماری سخت دل آزاری کی ہے۔"

آفتاب رائے اچنبھے سے کشوری کو دیکھتے رہے — ارے تُو تو ڈپٹی عباس کی بٹیا ہے نا۔اری باؤلی سی — وہ بے ساختہ کہنا چاہتے تھے۔لیکن کشوری کے تیور دیکھ کر رک گئے اور پہلو بدل کر سنجیدگی سے کھنکارے "بات یہ ہے مس عباس —" انھوں نے کہنا شروع کیا۔سیاست۔ اور حصولِ تعلیم کے درمیان جو —"

"اجی ڈاکٹر صاحب بس اب رہنے دیجئے —" کسی نے آگے بڑھ کر کہا —

"ہم خوب اس ڈھونگ کو جانتے ہیں۔معافی مانگئے قبلہ —"

"ڈاکٹر صاحب۔ہم نے کہا بنارس کیوں نہیں واپس چلے جاتے —؟" دوسری آواز آئی۔

"دیکھو میاں صاحبزادے —" آفتاب رائے نے رسان سے کہا —

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاریخ کے متعلق میرے چند نظریے اور اصول ہیں۔ میں اور تمہاری دل آزاری کروں گا؟ کیا باتیں کرتے ہو ــــ ؟"

"ہم کچھ نہیں جانتے ــــ" انہوں نے شور مچایا ــــ "معافی مانگئے۔ ورنہ ہم کل اورنگ زیب ڈے منائیں گے۔"

"ضرور مناؤ ــــ" آفتاب رائے نے یک لخت بے حد اُکتا کر کہا۔

"اور مکمل اسٹرائیک کریں گے۔"

"ضرور کرو ــــ خدا مبارک کرے ــــ" انہوں نے آہستہ سے کہا اور چق اُٹھا کر اندر چلے گئے۔

"کٹر مہاسبھائی نکلا یہ بھی ــــ" لڑکوں اور لڑکیوں نے آپس میں کہا اور برساتی سے باہر نکل آئے۔

وہ رات آفتاب رائے نے شدید بے چینی سے کاٹی۔ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ مسلمان طالب علموں کو اچھے نمبر نہ ملتے۔ ہندوؤں کو یوں ہی پاس کر دیا جاتا۔ ہوسٹلوں میں ہندو مسلمان اکٹھے رہتے تھے۔ لیکن جس ہوسٹل میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس پر سبز پرچم لہرانے لگا تھا۔ اس کے جواب میں عین مغرب کی نماز کے وقت ہندو اکثریت والے ہوسٹلوں میں لاؤڈ سپیکر نصب کر کے گراموفون بجایا جاتا۔

چند روز بعد آفتاب رائے کے سر میں جانے کیا سمائی کہ استعفا دے دیا اور غائب ہو گئے۔ سارے میں ڈھنڈیا مچ گئی۔ مگر ڈاکٹر آفتاب رائے نہ اب ملتے ہیں نہ تب۔ لوگوں نے کہا ایک چُول ہمیشہ سے ذرا ڈھیلی تھی۔ سنیاس لے لیا ہوگا۔ پھر تقسیم کا زمانہ آیا۔ اب کسے ہوش تھا کہ آفتاب رائے کی فکر کرتا۔ اپنی ہی جانوں کے لالے پڑے تھے۔

ملک آزاد ہو گیا۔ کھیم دتی کی شادی ہو گئی۔ کشوری کے گھر والے آدھے پاکستان چلے گئے۔ اس کے بابا اب بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے کم سجھائی دیتا تھا۔ ایک ٹانگ پر فالج کا اثر تھا۔ دن بھر وہ جون پور میں اپنے گھر کی بیٹھک میں پلنگڑی پہ لیٹے نادِ علی کا ورد کیا کرتے اور پولیس ہر ہفتے ان کو تنگ کرتی۔ آپ کے بیٹے کا پاکستان سے آپ کے پاس

ب خط آیا تھا؟ آپ نے کراچی میں کتنی جائداد خرید لی ہے؟ آپ خود کب جا رہے ہیں؟
اصغر عباس ان کا اکلوتا لڑکا تھا اور اب پاکستانی فوج میں میجر تھا نہ وہ ان کو خط لکھ سکتا اور اگر مر جائیں تو مرتے وقت وہ اس کو دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔ وہ تو کستوری کے لئے مصر تھا کہ وہ اس کے پاس راولپنڈی چلی آئے۔ لیکن ڈپٹی صاحب ہی نہ راضی ہوئے کہ انت سمے بٹیا کو بھی نظروں سے اوجھل کر دیں۔ وہی کستوری تھی جس کی ایسے بسم اللہ کے گنبد میں پرورش ہوئی تھی اور اب وقت نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ وہ جون پور کے گھر کی چار دیواری سے باہر مدتوں سے لکھنؤ کے کیلاش ہوسٹل میں رہ رہی تھی۔ ایم۔ اے میں پڑھتی تھی اور اس فکر میں تھی کہ بس ایم اے کرتے ہی پاکستان پہنچ جائے گی اور ملازمت کرے گی۔ ارے صاحب آزاد قوم کی لڑکیوں کے لئے ہزاروں با عزت راہیں کھلی ہیں، کالج میں پڑھایئے۔ نیشنل گارڈ میں بھرتی ہو جیے۔ اخباروں میں مضمون لکھیے، ریڈیو پر بولئے۔ کوئی ایک چیز ہے جی ہاں۔ وہ دن گن رہی تھی کہ کب دو سال ختم ہوں اور کب وہ پاکستان اڑنچھو ہو — لیکن پھر بابا کی بجنت آڑے آجاتی۔ دکھیا اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ آنکھوں سے سجھائی بھی نہیں دیتا۔ کہتے ہیں بٹیا کچھ دن اور باپ کا ساتھ دے دو۔ جب میں مر جاؤں تو جہاں جا ہے جانا۔ چاہے پاکستان چاہے انگلینڈ اور امریکہ — میں اب تمہیں کسی بات سے روکتا تھوڑا ہی ہوں۔ بٹیا تم بھی چلی گئیں تو میں کیا کروں گا۔ محرم میں میرے لئے سوز خوانی کون کرے گا۔ میرے لئے لوکی کا حلوہ کون بنائے گا۔ پوت پہلے ہی مجھے چھوڑ کر چل دیا۔ پھر ان کی آنکھیں بھر آتیں اور وہ اپنی سفید داڑھی کو جلدی جلدی پونچھتے ہوئے یا علی کہہ کر دیوار کی طرف کروٹ کر لیتے۔

بڑی بھاوج ان سے کہتیں — دیوانے ہوئے ہو۔ بٹیا کو کب تلک اپنے پاس بٹھلاؤ گے۔ آج نہ گئی کل گئی۔ جانا تو اسے ہے ہی ایک دن یہاں اس کے لئے اب کون سے رشتے رکھے ہیں۔ سارے اچھے اچھے لڑکے ایک ایک پاکستان چلے گئے اور وہاں ان کی شادیاں بھی دھبادھب ہو رہی ہیں۔ یہ اصغر عباس کے پاس پہنچ جاتی تو وہ اسے بھی کوئی ڈھنگ کا لڑکا دیکھ کر ٹھکانے لگا دیتا — بڑی بھاوج کی اس شدید حقیقت

پسندی سے کشوری کو اور زیادہ کوفت ہوتی اور یہ ایک واقعہ تھا کہ اس نے پاکستان کے مسئلے پر اس زاویے سے کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ ویسے وہ سوچتی کہ بابا ہندوستان میں ایسا کیا کھونٹا گاڑ کر بیٹھے ہیں۔ اچھے خاصے ہوائی جہاز سے چلے چلتے مگر نہیں اور یہ جو بابا کی قوم پرستی تھی۔ سارا جون پور عمر بھر سے واقف ہے کہ بابا کتنے بڑے نیشنلسٹ تھے۔ تب بھی پولیس پیچھا نہیں چھوڑتی۔ سارے حکام اور پولیس والے جن کے سنگ جنم بھر کا ساتھ کا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ وہی اب جان کے لاگو ہیں۔ کل ہی عجائب سنگھ چوہان نے جو عمر بھر سے روزانہ بابا کے پاس بیٹھ کر شعر و شاعری کرتا تھا دو بار دوڑ بھجوا کر خانہ تلاشی لی۔ گویا ہم نے بندوقوں اور ہتھیاروں کا پورا میگزین دفن کر رکھا ہے۔ پھر اسے بابا پہ ترس آجاتا۔ بچارے بابا۔

اب ڈپٹی صاحب کی مالی حالت بھی ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ اصغر عباس پاکستان سے روپیہ نہ بھیج سکتا تھا جو تھوڑی بہت زمینیں تھیں۔ ان پر ہندو کاشتکار قابض ہو گئے تھے اور دیوانی کی عدالت میں ڈپٹی صاحب کی فریاد کی شنوائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چھوٹی آپا مرحومہ کی مقدمہ بازیوں کے بعد جو کچھ زیور بچ رہا تھا وہ بڑی بھاوج نے سمیٹ کر بہو کے حوالے کر دیا تھا جو پاکستان لے گئی تھی۔ باقی روپیہ ڈپٹی صاحب کی پنشن کا کشوری کی تعلیم پر خرچ ہو رہا تھا۔ ان کے علاج کے لئے کہاں سے آتا اور فالج تو ہُوا ایسا روگ ہے کہ جان لے کر پیچھا چھوڑتا ہے۔ چنانچہ نوبت یہ پہنچی کہ چپکے چپکے بڑی بھاوج نے چھوٹی بیگم کے ذریعے چند ایک گہنے جو بچ رہے تھے فروخت کروا دیئے۔ ویسے اس میں ایسی شرم کی تو کوئی وجہ نہ تھی وہ جو مثل ہے کہ مرگِ انبوہ جشنے دارد، اَن گنت مسلمان گھرانے ایسے تھے جو اپنے اپنے گہنے اور چاندی کے برتن بیچ بیچ کر گزارہ کر رہے تھے لیکن بڑی بھاوج ناک والی آدمی تھیں اور ابھی ان کے بھلے وقتوں کو گزرے عرصہ ہی کتنا ہوا تھا۔ کشوری کو جب یہ معلوم ہوا تو اس کی سٹی گم ہو گئی۔ اس نے پاکستان جانے کا خیال ترک کر دیا اور سرگرمی سے ملازمت کی تلاش میں جٹ گئی۔

لیکن ایک جگہ تو اس سے صاف صاف کہہ دیا گیا صاحب بات یہ ہے کہ جگہ تو خالی

، لیکن ہم شرنار تھی لڑکیوں کو ترجیح دے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ آپ کسی نائگی مجبوری کی وجہ سے ہندوستان میں رکی ہوتی ہیں۔ پہلا موقع ملتے ہی آپ بھی پاکستان چلی جائے گا۔

اور وہ گھوم پھر کر جون پور لوٹ آئی۔ بڑی بھاوج نے اس سے کہا ـــــ وہ تمہاری دنیاں بھیم کے ماموں آفتاب بہادر تھے۔ ان کو ہی جا کر پکڑو۔ وہ تو بڑے با اثر آدمی ہیں اور بڑے شریف ضرور مدد کریں گے اور کشوری کو خیال آیا کس طرح وہ جلوس بنا کر ان کے پاس پہنچی تھی اور ان کو سخت سست سنائی تھیں۔ اس کے اگلے ہفتے ہی وہ غائب ہو گئے تھے۔

آفتاب رائے ـــــ اب پتہ نہیں وہ کہاں ہوں گے۔ اڑتی اڑتی سنی تھی کہ بمبئی میں حکومت کے خلاف تقریر کرنے کے جرم میں ان کو احمد آباد جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔ جیل سے چھوٹے تو کچھ اور گڑبڑ ہوئی اور اب شاید وہ روس میں ہیں اور سمرقند ریڈیو سے اردو میں خبریں سناتے ہیں۔ دوسری روایت تھی کہ نہیں صاحب ڈاکٹر آفتاب رائے تو آج کل پنڈت جی کی بالکل مونچھ کا بال بنے ہوئے ہیں اور ان کو ری پبلک یمی ڈورا میں ہند کا سفیر بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب تو عرصے سے گویا مستقل "زیر زمین" تھے۔

بیچارے آفتاب رائے۔

آج چاند رات تھی۔ محلے میں نقارہ رکھا جا چکا تھا۔ مجلسیں اب بھی ہوتیں۔ لیکن وہ چہل پہل، رونق اور بے فکری تو کب کی خواب و خیال ہو چکی تھی۔ ڈیوڑھی میں ڈولیاں اترنی شروع ہوئیں اور بیبیاں آ آ کر امام باڑے کے دالان میں بیٹھنے لگیں۔ کشوری بیدلی سے دہلیز پر اپنی پرانی جگہ پر بیٹھی رہی۔ دالان کی چاندنی جس پر تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی تھی۔ اب چھدری چھدری نظر آتی تھی۔ سارے خاندانوں میں سے دو دو تین تین افراد تو ضرور ہی ہجرت کر گئے تھے۔ بڑی بھاوج بہت مشکل سے پاؤں گھسیٹتی اِدھر اُدھر چل رہی تھیں۔ اب وہ الله تلے کہاں۔ ساری مہریاں اور کہاریں اور پاسیں ایک ایک

کہہ کے چھوڑ کہ چل دیں۔ بس نگوڑی نمولہ رہ گئی تھی۔ سو اس کی آواز کو بھی پالہ مار گیا تھا لیکن چھمّو بیگم کو آتا دیکھ کر وہ پھر للکاری ـــــ آگئیں چھمّو بیگم ـــــ آؤ جم جم آؤ۔

چھمّو بیگم چپ چاپ آکر منبر کے پاس کھڑی ہو گئیں زیارت پڑھ کے تعزیوں کو جھک کر سلام کرنے اور کنپٹیوں پر انگلیاں چٹخا کر جناب علی اصغرؑ کے سبز چار جٹ کے گہوارے کی بلائیں لینے کے بعد انہوں نے علموں کو مخاطب کر کے آہستہ سے کہا ـــــ "مولاؑ یہ میرا آخری محرّم ہے۔ ارے اب تمہاری مجلسیں یہاں کیسے کروں گی" ـــــ اور یہ کہہ کر انہوں نے زور شور سے رونا شروع کر دیا۔

بُوا اُمّدن اپنی پرانی "دشمنا گی" فراموش کر کے سرک کر ان کے قریب آبیٹھیں اور بولیں ـــــ "لو بُوا غم حسینؑ کو یاد کرو۔ اپنا غم ہلکا ہو جائے گا ـــــ مولاؑ تو ہر جگہ ہیں۔ کیا پاکستان میں نہیں ہیں ـــــ"

"ہاں ـــــ ہاں ـــــ" باقی بیبیوں نے آنسو خشک کرتے ہوئے تائید کی ـــــ "مولاؑ کیا پاکستان میں نہیں ـــــ تم وہاں مولاؑ کی مجلسیں قائم کرنا"

"لو بوا ـــــ ہم بھی چل دیئے پاکستان ـــــ" جب محفل کی رقّتِ ذرا کم ہوئی اور چھمّو بیگم چاند رات کا بیان ختم کر چکیں تو بُوا اُمّدن نے اپنا اناؤنسمنٹ بھی کر ڈالا۔

"سچ کہو بُوا اُمّدن ـــــ" بڑی بھاوج نے گوٹا پھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بیوی چل دیئے ہم بھی ـــــ" بوا اُمّدن نے اعتراف کیا۔

"کیسے چل دیں ـــــ؟" بڑی بھاوج کو ایک طرح سے تو رشک ہی آیا۔ اچھے خاصے لوگ نکلتے چلے جا رہے ہیں۔ سب فضیحتوں سے الگ۔ سارے دلدر دور ہو جائیں گے وہاں پہنچ کر۔

"بس بڑی بھاوج لڑکا نہیں مانتا ـــــ وہاں سے ہر بار خط میں لکھتا ہے کہ بس آماں آجاؤ ـــــ کوئی نگوڑی جگہ سکھر ہے۔ وہاں اس نے راشن کی ڈپو کھول لی ہے"

"اچھا ـــــ؟ شکر ہے مولا سب کی بگڑی بنائیں ـــــ" بڑی بھاوج نے کہا۔

"عاشورہ کی شب بیلے ـــــ" بوا اُمّدن نے جو حسبِ معمول عینک گھر بھول آئی

تھیں ۔ دوبارہ غلط مرثیہ شروع کیا۔ لیکن سب پر ایسی اُداسی اور اکتاہٹ طاری تھی کہ کسی نے ان کی تصحیح کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ بلّن نے آواز ملائی ——— چراغوں کی روشنی دالان میں مدھم سا زرد اُجالا بکھیرتی رہی۔ آنگن کا گیس کا ہنڈہ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔

اس تاریکی میں کشوری سیاہ دوپٹے سے سر ڈھانپے اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھی سامنے رات کے آسمان کو دیکھتی رہی۔

۸

کنول کماری جین نے مہمانوں کے جانے کے بعد نشست کے کمرے میں واپس آکر دریچوں کے پردے گرائے اور چار کا سامان میزوں پر سے سمیٹنے لگی۔ مدراسی آیا ایک ہی تھی جسے وہ ہمراہ لینی آئی تھی اور پردیس میں ملازموں کے فقدان پر اس نے ملٹری اڈوائزر بریگیڈیر کھنّہ کی بیوی سے بڑا رقت انگیز تبادلہ خیالات کیا تھا۔ گھر کی صفائی اور بچّے کی دیکھ بھال کے بعد جو اسے وقت ملتا اس میں وہ رائل اکیڈمی آف ڈریمٹک آرٹ جاکر بوگرنی سیکھتی تھی۔ سر لارنس اور لیڈی اولیویر، اینتھنی ایسکو یتھ کرسٹفر فرائی ان سب سے اس کی بڑی گہری دوستی تھی۔ یہ سب مل کر گھنٹوں فن اداکاری، جدید آرٹ اور ہندوستانی بیلے پر گفتگو کرتے۔ جین کے پاس ان سب بکھیڑوں کا وقت نہ تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے رات کے تو وہ دفتر سے پلٹ کر انڈیا ہاؤس سے لوٹتا۔ اور وہ تو صاف بات کہتا تھا کہ بھائی میں انٹلکچوئیل و نٹلکچوئیل نہیں ہوں۔ سیدھا سادا آدمی ہوں اور جس ڈھرّے پر سن پینتیس سے چل رہا ہوں۔ وہی میرے لئے ٹھیک ہے انگریز کے زمانے میں وہ ملک کے طبقاتی قطب مینار کی سب سے اونچی سیڑھی پر پہنچ چکا تھا اور اب تو وہ اتنا اونچا تھا کہ بالکل بادلوں پر براجمان تھا۔ انگریز کے زمانے میں ڈریس سوٹ پہنتا۔ اب سفید چوڑی دار پاجامے اور سیاہ شیروانی میں ملبوس سفارتی ضیافتوں میں کیا ہلکی پھلکی پتی تلی باتیں کرتا۔ خود کنول کیا کم معرکے کی خاتون تھی۔ جہاں جاتی محفل جگمگا اُٹھتی۔ واہ واہ۔ مثلاً آج ہی کی پارٹی میں اس نے کوریا کی کرشنا مینن والی تجویز کے

سلسلے میں "نیو اسٹیٹس مین اینڈ نیشن" کے ایڈیٹر کنگسلے مارٹن اور جدید شاعر لوئی مک نیس دونوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ سب کو قائل ہونا پڑا۔ چاند باغ کے اچھے پرانے سنہرے دنوں میں تو خیر وہ یوں ہی جھپسٹ میں انٹلکچوئل بن گئی تھی کہ یونیورسٹی کی زندگی کا یہ ایک لازمی جزو تھا۔ پر یہ تو ان دنوں اس کے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز وہ ان ساری جید بین الاقوامی گلیمرس ہستیوں سے یوں بھائی چارے کے ساتھ ملا کرے گی جیسے وہ سب گاجر مولی ہیں۔

"سوریہ است ہوگیا ــــ سوریہ است ہوگیا ــــ" ارملا گنگناتی ہوئی اندر آئی۔

"کنول دیدی ــــ جاتے جاتے مجھے خیال آیا کہ ایک بار آپ کو پھر یاد دلادوں کہ آپ کو مجلس میلے میں آنا ہے ــــ"

"ہاں ہاں بھئی ــــ" کنول نے جواب دیا "اور وہ میری کتاب تو دیتی جاؤ ــــ"

"ارے ہاں ــــ" ارملا نے رک کر کہا "وہ تو ڈاکٹر آفتاب رائے نے مجھ سے لے لی۔ وہ مجھے انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے۔ چھین کر لے گئے، کہنے لگے کل دے دیں گے ــــ"

"ڈاکٹر ــــ آفتاب ــــ رائے ــــ؟" کنول نے دہرایا۔

"ہاں کنول دیدی ــــ" ارملا نے اسی طرح لاپروائی سے بات جاری رکھی "وہ تو دن بھر یوں ہی لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں۔ آج کل ایک نئی کتاب لکھ رہے ہیں۔ آج مہینوں کے بعد اتفاقاً نظر آگئے۔ ان کا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ لیکن کل وہ براڈ کاسٹنگ ہاؤس آرہے ہیں۔ وہاں کتاب مجھے لوٹا دیں گے۔ اچھا گڈ نائٹ کنول دیدی۔"

"گڈ نائٹ ارملا ــــ"

"ارے ہاں" اس نے جاتے جاتے رک کر پھر کہا "کل آپ رائل کمانڈ پرفورمنس میں جارہی ہیں ــــ؟ آپ کو تو سر الف رچرڈسن نے خود ہی بلایا ہوگا"

"ارے نہیں بھئی ــــ" کنول نے پیشانی پر سے بال ہٹا کر تھکی تھکی ہوئی آواز میں کہا "تو یہ بھی اس کا ایک پوز ہے" ایک دل جلی مسز اچاریہ تھی جو سیکنڈ سیکرٹری کی بیوی تھی۔

مارے حسد کے اپنی ایک سہیلی سے کہا تھا " جانتی ہے کہ بکھرے ہوئے بال اس کے اوپر زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ چرٹبل کہیں کی؟ نہیں بھئی ارملا مجھے یہ پارٹیوں اور سفارتی مصروفیتوں کا سلسلہ بعض دفعہ بالکل بور کر دیتا ہے اس سے کہیں پناہ نہیں ——"

" اچھا گڈ نائٹ —— "

" اچھی طرح سوؤ —— "، کنول نے کہا۔ ارملا ہر نیدر ناتھ چٹو پادھیا کا کوا س گنگناتی ہوئی نچلی منزل میں اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے —— ڈاکٹر آفتاب رائے مل گئے —— اجی ان کا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ چھین کر لے گئے —— کہنے لگے کل دے دیں گے —— وہ صوفے پر بیٹھ گئی " —— واسنتھی —— "، اس نے چلا کر آواز دی " کھانا گرم کر دو —— "، اس نے ٹیلی ویژن کھولا۔ بکواس ہے۔ بند کر دیا۔ پھر اس نے ریڈیو لگایا۔ بکواس تھا۔ اسے بھی بند کر دیا۔ کیا پتہ اس سمے لکھنؤ ریڈیو پر ارچنا بنیرجی گا تی ہو پو ہوڑی جھوڑ نا —— مکر مکر یو جرئے ہو —— اور چاند باغ کی خاموش سڑکوں پر سے لڑکیاں لینٹرن سروس کے بعد لوٹتی ہوں گی۔

میں نے کیا کیا تھا ——؟ اس نے سوال کیا۔ کچھ نہیں۔ میں اب دس سال سے کنول کماری جین ہوں۔ یہ تو کچھ بات نہ بنی۔ بات کس طرح بنتی ہے کیوں نہیں بنتی —— سال گزرتے جا رہے ہیں۔ میں کنول کماری جس نے یہ سب دیکھا۔ ایک روز یوں ہی ختم ہو جاؤں گی اور تب بہت اچھا ہو گا۔

ایسا نہ ہونا چاہیئے تھا۔ پر ہو گیا۔

کنول ڈارلنگ —— ثروت نے انگلی اٹھا کر سخت صوفیانہ انداز میں اس سے کہا تھا —— جن ڈھونڈھا تن پائیاں گہرے پانی بیٹھ ——

—— میں برہن ڈوبت ڈری رہی کنارے بیٹھ —— ؟ کنول نے سوچا تھا۔ کنارا ابھی تو نہیں ہے ——

پانے کے کیا معنی ہیں؟ کیا ملتا ہے؟

باہر اندھیرا تھا اور سردی، اور بیکراں خاموشی۔ میں زندہ ہوں۔
ارے بھائی آفتاب بہادر —— اس نے غصے سے سر ہلا کر دل میں سوال کیا ——
تم کیوں چلے گئے تھے۔ میں نے تمہارا کچھ بگاڑا تھوڑا ہی تھا۔ تم اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں وہیں کہیں تمہاری زندگی کے تانے بانے کے کسی کونے میں آ کر چپکی بیٹھ جاتی اور بس تمہارے لئے پوریاں بنایا کرتی۔ تم اسی طرح رہتے۔ اس میں تمہاری شکست نہ تھی۔ تمہاری تکمیل تھی میاں آفتاب بہادر —— ؟
نیچے کیرل گانے والے ہنستے کی اور نکل گئے تھے۔
آفتاب بہادر —— اب جو میں ہوں۔ اور جو تم ہو —— کیا یہی بہت ٹھیک ہے؟
بہت زمانہ ہوا اس نے چاند باغ میں ایک لڑکی کو دیکھ کر جو آفتاب رائے کو بہت پہلے سے جانتی تھی۔ سوچا تھا کہ جانے آفتاب کی بیوی کیسی ہوگی (ایک بار خود اس کے لئے اس کی دوست ثروت نے ایک بور سے آدمی کی تصویر سامنے لا کر کہا تھا۔ آنے والے دور کی دھندلی سی اِک تصویر دیکھ —— !! اور کمال یہ کہ عین مین اسی طرح کا آدمی جلین نکلا ——)
آفتاب کی بیوی۔ یہ فقرہ کتنا عجیب لگتا تھا۔ کوئی ہوگی چڑ چڑی۔ آخر میں یہ سب کریم کھاتے ہیں۔ ثروت نے اضافہ کیا تھا۔ خوبصورت تو ضرور ہوگی اور ٹینس کھیلتی ہوگی جس کا آفتاب کو اتنا شوق ہے۔ لیکن فراٹے بھرنے اور ہوائیں اڑنے والی لڑکیاں تو وہ سخت ناپسند کرتا تھا۔ جس کو وہ پسند کرے گا وہ تو بہت ہی عمدہ ہوگی بس بالکل مجموعہ خوبی۔ چندے آفتاب چندے مہتاب۔ جی ہاں اور مجھ میں کیا برائی تھی؟ اس نے طے کرنا چاہا۔ کہ آفتاب کا رویہ یہ تھا کہ اس پر کنول کماری پر یہ وحی اترنی چاہیئے تھی کہ یہ مہاپرش، آسمان پر سے خاص اس کے لئے بھیجا گیا ہے لیکن یہ اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اس کنول کماری سے یا روزانہ آ کر ملے یا کبھی نہ ملے۔ اس سے طبلہ اور جیجے ونتی سنے۔ پوریاں بنوا کر کھائے۔ پھر ایک روز اطمینان سے آگے چلا جائے۔ اور یہ کنول کماری بعد میں بیٹھ کر جھک مارتی رہے اور کیا وہ اس کے پیچھے پیچھے ڈنڈا لے کر دوڑتی کہ اے میاں آفتاب بہادر ایک بات سنتے جاؤ —— ان دنوں

ثروت نے ایک اور لطیفہ ایجاد کیا۔ چلّیں کے بعد ایک روز اس نے "گیٹنگ"، کی باقی افراد سے کہا:—— بھئی نمبر ۲۹۔ اے پی سین روڈ پر آج کل یہ سلسلہ ہے اگر بھائی آفتاب چا پیتے پیتے رک کے۔ دفعتاً کنولا رانی سے کہتے ہیں۔ بھئی کنول مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے تو ہماری کنولا رانی کو فوراً یہ دھیان ہوتا ہے کہ اب شاید یہ پروپوز کرنے والا ہے۔ پر وہ بات محض اتنی ہوتی ہے کہ بھئی ذرا مہی پال کو فون کر دو۔ کہ آم خریدتا لائے یا اسی قسم کی کوئی اور شدید اینٹی کلائمیکس۔ ثروت اس قدر کمینی تھی —— وہ سارے مسخرے پن کے قصے یاد کر کے اب اس نے دل میں ہنسنا چاہا۔ لیکن سردی بڑھتی گئی اور بیکراں تنہائی۔ اور زندگی کے ازلی اور ابدی پچھتاووں کا ویرانہ۔ آفتاب بہادر تم کو پتہ ہے کہ میری کیسی جلا وطنی کی زندگی ہے ذہنی طمانیت اور مکمل مسرت کی دنیا جو ہو سکتی تھی۔ اس سے دیس نکالا جو مجھے ملا ہے۔ اسے بھی اتنا عرصہ ہو گیا کہ اب میں اپنے متعلق کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب میرے سامنے صرف لائل کمانڈر پر فورینس اور جین کے صبح کے ناشتے کی دیکھ بھال ہے اور یہ ہر دلعزیزی جو مجھ پر ٹھونس دی ہے لیکن تم بھلا کیا سوچو گے (اس نے کہا تھا۔ ارے تم لوگ اسی کو پسند کرتی ہو جو ایک مخصوص معیار پر پورا اترتا ہے) کیا الٹی منطق تھی۔ یعنی چت بھی تمہاری پٹ بھی۔ آخر اس ساری لفاظی، اس ذہنی اور تصوّراتی گورکھ دھندے سے تمہارا مطلب کیا نکلا۔ واہ وا۔ چغد آدمی کہیں کے۔

- ثروت نے اس کی شادی کے بعد ایک اور سہیلی کے سامنے نہایت جامع و مانع اختصار کے ساتھ اس طرح تشریح کر دی تھی کہ قصّہ کو یوں مختصر کرتی ہوں اے عزیزہ کنول کی ٹریجڈی یہ ہوئی کہ ساری عمر تو کوئی ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ سب میں مین میکھ نکالتی رہیں اور مارے بد دماغی کے کسی کو خاطر ہی میں نہ لاویں اور جن بزرگوار کو آپ نے نہایت صدقِ دل سے پسند فرمایا۔ وہ خود ہی ہری جھنڈی دکھا گئے —— بس اب کیا ہے پیاری بہن۔ جب آنکھ کھلی تو گاڑی نکل چکی تھی۔ پٹری چمک رہی تھی ——

جی ہاں۔

- ارے ثروت —— کہ ٹوک کہیں کی۔

مگر سوال یہ تھا کہ ہر چیز کے متعلق اس مذاق اور خوش دلی کا رویہ کہاں تک گھسیٹا جا سکتا تھا (لیکن اس کے علاوہ تم اور کر بھی کیا سکتی ہو۔ ثروت نے کہا تھا) زندگی نہ ہوئی اسٹیفن لیکاک کا مسخرہ پن ہو گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہارا مذاق کہاں ہونا ہے اور سنجیدگی کہاں سے شروع ہوتی ہے (یا VICE—VERSA)

ڈاکٹر صاحب تو دن بھر لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں اور آج کل ایک اور کتاب لکھ رہے ہیں۔ اسے ارملا نے مطلع کیا ہے اب وہ کیا کر رہا ہے۔ ڈاکٹر ڈی۔ پی مکرجی کی طرح مہا گرو بن چکا ہے۔ غالباً اس نے شادی کر لی ہو گی۔ یہاں پہنچ کر اسے عجیب و غریب اور انتہائی شدید تکلیف کا احساس ہوا ——— (وہ کون ہو گی ——— کیسی ہو گی ——— آفتاب کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کیسی نظر آتی ہو گی۔ آفتاب اس سے کہاں ملا ہو گا) یا اب تک وہ کنفرمڈ بیچلر بن چکا ہو گا (بہت سے لوگوں کے لئے اس میں بھی سخت گلیمر تھا) ——— کیا بات ہے صاحب ——— ان ساری حماقتوں سے علیحدہ اور برگزیدہ ——— اپنی نہایت شخصی دنیا، اپنے مشغلے، کتابیں، موسیقی، بیتھوون کے کونسرٹ، چند دلچسپ سے گنے چنے دوست۔ اتوار کے روز دن بھر کسی کنٹری کلب کی لاؤنج میں بیٹھے ٹائمز پڑھ رہے ہیں تیسرے پہر کو رائیڈنگ کو چلے گئے اور ٹینس کھیلا۔ اِدھر اُدھر خواتین سے بھی مل لئے۔ لیکن لڑکیوں کو ہمیشہ بڑے ترحم کی نگاہوں سے دیکھا گویا ——— بے چاریاں ——— ! اور اپنا بے نیازی اور سرپرستی کا رویہ قائم رکھا ——— (یہ سب ثروت نے ایک دفعہ ارشاد کیا تھا) اچھا بھئی آفتاب بہادر ——— تم کتابیں لکھتے رہو ہم ان پر تھرڈ پروگرام میں ریویو کریں گی، راستہ اسی طرح طے ہوتا رہے گا۔

صبح ہوئی شام ہوئی ——— زندگی تمام ہوئی ——— زندگی تمام ہوئی ——— نچلی منزل میں ارملا ہریندر ناتھ چٹوپادھیا کا وہ کم بخت کورس آہستہ آہستہ الاپے جا رہی تھی۔

وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ لہر اب کم ہو گیا تھا اور آسمان کا رنگ قرمزی تھا جس کے مقابل میں کینجھونک۔ چرچ کے ہولناک گنبد کا سلہٹ نحوست سے اپنی جگہ پر قائم تھا۔

اونی لبادوں میں ملفوف، مشرقی یورپ سے بھاگے ہوئے لوگ بھاری بھاری قدم اُٹھاتے ہاتھوں میں شمعیں لئے ! ... ماس کے لئے گرجا کی سمت بڑھ رہے تھے۔

صبح ہوئی شام ہوئی
زندگی تمام ہوئی
زندگی تمام ہوئی
زندگی تمام ہوئی

۹

"جب مجھے ملازمت نہ ملی تو میں نے سمندر پار کے وظیفوں کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ برٹش کونسل نے مجھے یہاں آنے کا وظیفہ دے دیا اور جب میں نے روانہ ہونے کی خبر بابا کو سنائی تو وہ بالکل چپ ہو گئے اور اس کے بعد ایک لفظ منہ سے نہ بولے اور ابھی میں لٹنے ہی میں تھی۔ جب مجھے اطلاع ملی کہ بابا مر گئے ——" کشوری نے مدھم آواز میں بات ختم کی اور جھٹکے سے آتش دان میں لکڑی کے کندوں کو ٹھیک کرنے میں منہمک ہو گئی۔

"آج مڈنائٹ ماس منائے جائیں گے" روزماری نے اپنے برش اور کینوس سمیٹتے ہوئے کہا "چلو ہم برومپٹن اوریٹری چلیں۔ جہاں ایک شام میں نے پیلے بالوں اور اداس چہرے والی ایک ہینگرین پناہ گزین لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ سر پہ سیاہ اسکارف باندھے تسبیح ہاتھ میں لئے گھٹنوں سے ساکت اور منجمد بیٹھی تھی۔ اس کا یہ انداز کتنا قابلِ رحم تھا۔ میں نے قربان گاہ کے ستونوں کے پیچھے چھپ کر اس کی تصویر بنائی۔ میں نے اس تصویر کا نام "آزادی سے فرار" رکھا تھا۔ لیکن جب اسے نمائش میں رکھا جانے لگا تو ہم عصر فنون کی انجمن نے اس کا نام بدل کر "آزادی کا شکرانہ" کر دیا —— آج کی رات میں وہاں امید اور نا امیدی کی ان کرب ناک کیفیتوں کے چند اور اسکیچ تیار کروں گی۔

کتنی کیفیتیں ہیں جنہیں الفاظ اور رنگوں کے روپ میں ڈھالا ہی نہیں جا سکتا جن کے اظہار سے ان کی بے وقعتی اور توہین ہوتی ہے کشوری نے سوچا یہی بات، اپنے لئے کتنی بار کنول نے محسوس کی تھی لیکن کوئی کچھ نہ جانتا تھا)

کیسی بے بسی ہے کہ سب اپنے اپنے دائروں میں محصور رہے جلنے پر مجبور ہیں۔

"تم کو معلوم ہے کہ میں یک لخت اس طرح تم سب سے یہ باتیں کیوں کر رہی ہیں" کشوری نے کہا۔

"سنتے ہیں کہ جب مدتوں کے بچھڑے ہوئے دو بچے دوبارہ ملتے ہیں تو ساری پرانی یگانگت یاد آجاتی ہے۔ پرانے دوستوں سے مل کر سبھی کو خوشی ہوتی ہے" اس نے بات آہستہ آہستہ جاری رکھی ــــ "لیکن پرانے "دشمن" سے مل کر مجھے کیسی مسرت ہوئی ــــ آج صبح مجھے بالکل اتفاقیہ کھیم دتی پھر سے نظر آگئی۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ وہ یہاں پر ہے وہ ایک دوکان سے نکل رہی تھی "ارے کھیم ــــ کھیما ــــ" میں چلا کر اس کی اور دوڑی۔ اس نے مجھے واقعی نہ پہچانا۔ وہ بہت موٹی ہوگئی تھی اور اس کے ساتھ غالباً اس کا شوہر تھا۔ "کھیما رانی تم ہم کو نا ہیں چینہیں؟" میں نے بالکل بے ساختگی سے اپنی زبان میں اس سے کہا۔ جو اس کی اور میری مادری زبان تھی ــــ "ہیلو کشوری ــــ" اس نے مطلق کسی گرمجوشی کا اظہار نہ کیا "نمستے" اس کے شوہر نے مسکرا کر سلام کیا "یہ میرے پتی ہیں" کھیم نے اسی سرد مہری کے انداز میں بات کی "نمستے بھائی صاحب ــــ" میں نے بے حد خوش دلی سے کہا۔

"تم تو پاکستانی ہو۔ تمہیں نمستے نہ کہنا چاہیئے" کھیم نے بڑی طنز کے ساتھ کہا۔ میرے اُوپر جانو کسی نے برف ڈال دی۔ میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر دوسری اور دیکھا اس کے شوہر نے جو بہت سمجھدار معلوم ہوتا تھا۔ فوراً بات سنبھالی اور کہنے لگا ــــ "اچھا بہن جی ــــ اس سمے تو ہم بہت جلدی میں ہیں۔ آپ کسی روز ہمارے یہاں آیئے۔ ہم یہیں ساؤتھ کینسنگٹن میں رہتے ہیں ــــ" "اچھا۔ ضرور آؤں گی۔ بائی بائی کھیم ــــ" میں نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا اور آگے چلی گئی۔ میں نے اسے یہ بھی نہ بتانا چاہا کہ میں پاکستانی نہیں ہوں۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

"میں اس وقت کوئی رقت انگیز تقریر نہ کروں گی۔ میں یہ نہ کہوں گی۔ کہ رفیقو انسان نے خودکشی کر لی۔ پرانی اقدار تباہ ہوگئیں۔ اپنے پرائے ہوگئے یہ سب پچھلے پانچ سال سے دہراتے دہراتے تم لوگ اکتا نہیں گئے۔ یہ جو کچھ ہوا یہی ہونا تھا اور آپ تھیں کہ ایک نہایت رومینٹک

تصوّر لئے بیٹھی تھیں۔ گویا زندگی نہ ہوئی شانتا رام کی فلم ہو گئی۔ میں نے اور رکھیم نے جو کچھ کیا وہ ان سب باتوں کا نہایت منطقی نتیجہ تھا اور باقی تم جو کہنا چاہتی ہو وہ جھک مارتی ہو۔ سمجھیں۔

" اس انداز سے میں نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا۔ لیکن چلو روز ماری۔ اب ہم نئی تصویریں بنائیں گے " اس نے روز ماری کو مخاطب کیا " تم اگر ہمارے اسکیچ تیار کرو تو تمہاری آرٹ کونسل اور ہم عصر فنون کی انجمن ان کے لئے کون سے عنوان منتخب کرے گی ؟

" ہم اپنے بدقسمت ملک کی وہ نوجوان نسل ہیں جو یورپ کی جنگ اور اپنے سیاسی انتشار کے زمانے میں پروان چڑھی۔ اپنی خانہ جنگی کے دور نے اس کی ذہنی تربیت کی اور اب اس ہولناک " سرد لڑائی " کے محاذ پر اسے اپنے اور دنیا کے مستقبل کا تعین کرنا ہے۔

" ہم لوگ یونیورسٹی کی اونچی اونچی ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔ تہذیبی میلے اور تہوار منعقد کرنے میں مصروف ہیں سپر مارکیٹ کے مخصوص تھیٹروں میں اپنے بیلے کے پروگرام پلین کرتے ہیں۔ امن کانفرنسوں اور یوتھ فیسٹولز میں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں سے واپس لوٹ کر کیا ہوگا۔

" تم نے کبھی خیال کیا ہے کہ میں کہاں جاؤں گی ــــــ ؟ میرا گھر اب کہاں ہے ؟ کیا میں اور میری طرح دوسرے ہندوستانی مسلمان ایسے مضحکہ خیز اور قابلِ رحم کردار بننے کے مستحق تھے ــــــ ؟ ؟ "

وہ خاموش ہو گئی۔ سب لوگ چپ چاپ بیٹھے آگ کے شعلے کو دیکھتے رہے۔ سڑک کے دوسری طرف ایک مکان میں " وائٹ کرسمس " گائی جا رہی تھی۔

" شاید میں نے تمہیں بتایا تھا ــــــ " ارملا نے نیچی آواز میں کہا " کہ آج دفتر سے واپسی میں ڈاکٹر آفتاب رائے مل گئے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب میں نے سنا تھا کہ آپ ری پبلک پلبی ڈورا میں سفیر ہیں۔ تم نے غلط سنا تھا ــــــ انہوں نے رسان سے مسکرا کر کہا میں نے گھبرا کر ان کو دیکھا۔ تو کیا آپ بھی ــــــ میں نے سوال کرنا چاہا۔ ہاں ــــــ میں بھی ــــــ اتنا کہہ کر وہ جلدی سے خدا حافظ کہتے ہوئے مجمع میں غائب ہو گئے اور دوسرے لمحے اسٹیشن کی نیسبے انڈر گراؤنڈ نے ان کو نگل لیا۔ ان کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں اور وہ کسی سے

بات کرنا نہ چاہتے تھے ـــــ نجانے وہ کہاں رہتے ہیں، کیا کرتے ہیں۔ اتنا عرصہ انہوں نے کیسے گذارا۔ وطن واپس جانے کی اجازت انہیں کب ملے گی ـــ کیا ہوگا ـــ،،

دور، گرجاؤں کے گھنٹے بجنے شروع ہو گئے تھے۔ وہ سب، باہر سڑک پہ آ گئے۔

ہماری غلطیوں کا سایہ ہمارے آگے آگے چلتا ہے اور رات ہمارے تعاقب میں ہے۔ انہوں نے سوچا ـــ لیکن ہم رات کی وادی کو تیزی سے عبور کر رہے ہیں۔

ہمارے چاروں طرف یہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کا ہجوم یہ لوگ جو اپنی قسمتوں کو روتے ہیں لیکن دیکھو۔ یہ راستے۔ یہ جھیلیں۔ یہ باغات۔ ہمارے منتظر ہیں۔ سناٹے میں صرف موت کے قدموں کی چاپ تھی۔ ابھی موت جو یک لخت ہمارے سامنے آ گئی لیکن ہم اسے چھوڑ کر ہنستے ہوئے آگے نکل جائیں گے سنو۔ ہمارے پاس یقین ہے اور کامل اعتماد جسے اس محبت نے تخلیق کیا ہے جو غداری کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ غداری محض یاسمین کے پھولوں کی آرزو ہے وہ گرجا کی سمت بڑھتے رہے۔

سامنے راستے کی نیم تاریکی میں ایک الٹہ تھن وضع کے مکان میں دھندلی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ یہ ہندوستانی کمیشن کے فرسٹ سیکرٹری کا مکان تھا۔ اس کے آگے پھر اندھیرا تھا۔ یہ کون دیوانی روح اپنی تنہائی سے گھبرا کر باہر نکل آئی ہے انہوں نے سوال کیا۔ اس سے کہو یہ یہاں کیوں کھڑی ہے۔ ان لیمپوں کے نیچے گھاس کے ان راستوں پہ زمین کے ان پھولوں کے درمیان اسے کچھ نہ ملے گا۔ سنسان سیڑھیوں پہ یہ کون لوگ نظر آ رہے ہیں۔ ان سے کہو کہ واپس جائیں اور صبح کا انتظار کریں۔

ہمارے اور ان کے خیالوں کے بھٹنے ـــــ؟

لیکن پھر گھنٹوں نے پکارا ـــــ آؤ ـــــ آج کی رات تمہارے وجود کے گناہ کا کفارہ ادا کیا جائے گا۔ میں تمہارے خدا کی آواز ہوں اور تمہاری ہر تباہی میں شریک ہوں۔ اور ہر موت کا محافظ ہوں اور اب پادریوں اور راہبوں کا جلوس آگے بڑھا۔ جو اپنے اپنے ملکوں سے جلاوطن ہو کر اس سمے خداوند خدا کی تقدیس کرتے تھے اور گرجا کی مرمریں سیڑھیوں پر سیاہ اسکارف سے سر ڈھانپے عورتیں اور بوڑھے اور جوان بڑے صبر سے بیٹھے تسبیحیں

پھیر رہے تھے اور ہولی کمیونین کے منتظر تھے۔

ایک راستہ یہاں پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔ پھر ایک دیوار ہے۔ لیکن ریشمی پردوں میں سے چھن چھن کر روشنی اِدھر بھی پہنچ رہی ہے۔ گو بہت سے سیاہ پوش مریض دیوانے فلسفی اور بیمار سیاست دان راستہ روکے کھڑے ہیں۔

"ہمیں تمہاری موت عزیز ہے۔ کیوں کہ تمہاری موت میں نجات ہے۔ ماس کے گھنٹوں نے کہا۔

ہماری ماں۔ چٹانوں کی بہن۔ سمندر کے روشن ستارے ہمیں چپکا بیٹھنا سکھا۔ یہ ہمارا عہد نامہ ہے۔

یہ ہمارا پرانا عہد نامہ تھا۔ ان کے خیالات تباہ ہو چکے۔ اب ان کے پاس کیا باقی رہا ہے۔ آرگن کے مدھم اور لرزہ خیز سُروں کے ساتھ قدم اُٹھاتے ہوئے وہ سب آہستہ آہستہ اپنے راستے پر واپس آئے۔

کنولا رانی ——— کسی نے اندھیرے میں یک لخت پہچان کر چپکے سے پکارا۔ یہاں آ جاؤ۔ اور ہمارے ساتھ کھڑے ہو کر اس خوبصورت روشنی کو دیکھو جو آسمان پر پھیل رہی ہے اب کسی پچھتاوے۔ کسی افسوس کا وقت نہیں ہے۔

"پرانے عہد نامے منسوخ ہوئے" کنوری نے آہستہ سے دہرایا "ہم اس طرح زندہ نہ رہیں گے۔ ہم یوں اپنے آپ کو نہ مرنے دیں گے۔ ہماری جلاوطنی ختم ہو گی ——— ہمارے سامنے آج کی صبح ہے مستقبل ہے۔ ساری دنیا کی نئی تخلیق ہے"

لیکن کنول کماری ——— تم اب بھی رو رہی ہو ———؟

یاد کی اِک دھنک جلے

جب کبھی میں آگ بجھانے والا انجن شہر کی سڑکوں پر سے گزرتا دیکھتی ہوں تو مجھے ناصر چچا یاد آجاتے ہیں۔ فائر بریگیڈ اور ناصر چچا بچپن سے میرے ذہن میں لازم و ملزوم ہیں۔

ناصر چچا مٹیا برج کلکتہ کے ایک ماضی پرست، قدامت پسند اور وضعدار خاندان کے ایک فرد تھے وہ ابا جان کے بہت پرانے دوست تھے اور بے حد شگفتہ طبیعت اور پڑھے لکھے انسان تھے۔ اردو، فارسی اور انگریزی ادبیات کا علیٰ ذوق رکھتے تھے اور فائر بریگیڈ کے محکمے میں ملازمت کرتے تھے۔

بمبئی میں سمندر کے کنارے ان کا بہت لمبا چوڑا فلیٹ تھا۔ جس طرح کے پرانی وضع کے فلیٹ گرانکر اب سیمنٹ کے جگمگاتے ہوئے دس منزلہ رہائشی بلاک تعمیر کئے جا رہے ہیں۔

اس فلیٹ میں سیاہ و سفید چینی کے ٹکڑوں کی پچی کاری کا فرش تھا، اونچی چھتوں والے لق و دق کمرے اور لمبے لمبے برآمدے، جن کے چوبی جنگلے سبز روغن کے تھے۔ سامنے کے رخ پر سمندر تھا۔ جس میں پانی سے اُبھری ہوئی اِکا دُکا بھوری چٹانیں اور پہاڑیاں نظر آتی تھیں۔ جن میں ایک زمانے میں پرتگال کے بحری قزاقوں کے اڈے تھے۔

ناصر چچا کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے اکلوتے بچے علی اصغر کی پرورش ایک گوانی آیا کے سپرد تھی۔ سعیدہ چچی بچے کو تین سال کا چھوڑ کر اللہ میاں کے گھر سدھاری تھیں۔ اور مرتے وقت اسے گنہ بسی کو سونپ گئی تھیں اور اس سے کہا تھا کہ اگر تم اسے چھوڑ کر چلی

گئیں اور کہیں اور نوکری کر لی تو قیامت کے روز تم سے پوچھوں گی۔

گریسی گہری سانولی رنگت اور مضبوط کاٹھی کی اڑتیس سالہ غنتی اور وفادار عورت تھی۔ وہ بیس برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی اور دس برس تک اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھانے کے بعد ناصر چچا کے یہاں نوکر ہو گئی تھی اور آٹھ سال قبل جب سعیدہ چچی کلکتے سے بمبئی آئی تھیں۔ تب سے وہ ان کے پاس ملازم تھی۔ ان کی آخری بیماری میں گریس نے دن رات ایک کر کے ان کی خدمت کی تھی اور ان کے انتقال کے بعد سے علی اصغر کو بے حد دل سوزی سے پال رہی تھی۔ اور اس پر جان چھڑکتی تھی۔

میرے اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو اس مرتبہ ابّا جان چند ہفتے کے لئے مجھے اپنے ساتھ بمبئی لے آئے اور جب ہم لوگ اسٹیشن سے ناصر چچا کے گھر پہنچے تو گریس نے انتہائی جوش و خروش سے لپک کر ہمارا استقبال کیا اور سوٹ کیس اور ہولڈال خود اُٹھا اُٹھا کر اندر لے گئی۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹ خوشی کے مارے کھلے ہوئے تھے۔ اس کے بے انتہا چمکیلے دانت تھے اور چمکیلی آنکھیں، اس نے سبز کنارے والی اُودے رنگ کی سوتی ساڑھی پہن رکھی تھی اور بڑے سے جوڑے میں بمبئی کے رواج کے مطابق سفید پھولوں کا گجرا لپیٹا ہوا تھا۔ اپنی طرف کی سفید لنگے پہننے والی مرگلی اور بدمزاج آیاؤں کے مقابلے میں وہ مجھے بڑی شاندار اور ہنس مکھ معلوم ہوئی۔

ابّا جان اور ناصر چچا برآمدے کی آرام کرسیوں پر بیٹھ کر باتوں میں مصروف ہو چکے تھے اور میں جنگلے پر سے اُچک کر سمندر کو دیکھ رہی تھی کہ وہ جھاڑن سے ہاتھ پونچھتی دروازے میں نمودار ہوئی "صاحب، کھانا کیا بنانے کا؟" اس نے مستعدی سے استفسار کیا۔

"بھئی بتا دو کیا کھاؤ گے۔ گریس کھانا ایسا خوش ذائقہ پکاتی ہے کہ بامن کی بیٹی کلمہ بھرے" ناصر چچا نے ابّا جان سے کہا۔

"آرڈر" بے کر وہ باورچی خانے کی سمت چلی گئی۔

چچا کا آٹھ سالہ لڑکا اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے جا چکا تھا۔ میں سارے گھر میں گھومتی پھری اور باورچی خانے میں جھانکا جہاں گریس ساڑھی کا پلّو کمر میں ٹھونسے کھانا

تیار کرنے میں لگی تھی اور دوسرے نوکروں پر حکم چلاتی جا رہی تھی۔

تیسرے پہر کو فراغت پاکر وہ پچھلے برآمدے میں اپنے کمرے کے سامنے چٹائی بچھا کر بیٹھ گئی اور مجھ سے باتیں کرنے لگی۔

وہ عجیب اوٹ پٹانگ قسم کی کھچڑی زبان میں بات کرتی تھی جس سے میرے کان اب تک ناآشنا تھے اور تب وہ مجھے اپنی طرف کی کھڑکھڑاتے لٹھے کے بڑے گھیر والے لہنگوں اور سفید براق ململ کے دوپٹوں میں ملبوس مرگلی اور بدمزاج مگر نسبتاً علیق آیاؤں سے اور بھی مختلف معلوم ہوئی جو اتنی شستہ گفتگو کرتی تھیں۔ مگر بس دراصل بمبئی کے بیشتر عوام کی مانند ایک ہفت زبان خاتون تھی۔ وہ کوکنی کے علاوہ مرہٹی اور گجراتی بھی بولتی تھی اور اردو اور انگریزی کا قتل عام بھی کرتی رہتی تھی۔ اس کا شوہر جس سے اس نے پنجم میں لو میرج بتایا تھا، بمبئی کے ایک ہوٹل آرکسٹرا میں ڈرم بجاتا تھا اور شادی کے تیسرے سال ہی ایک حادثے میں مر گیا تھا۔ اس کے والدین بھی عرصہ ہوا مر چکے تھے۔ اس کا اکلوتا بھائی پی اینڈ او کے اسٹرینج مور جہاز پر کیبن اسٹیورڈ تھا اور وہ بھی مر چکا تھا۔ بمبئی میں اس کی صرف ایک "سگی والی" تھی جو اس کی خالہ زاد بہن تھی اور کبھی کبھی اس سے ملنے آجاتی تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد گریس نے بمبئی میں مختلف جگہوں پر آیا گیری کی تھی۔ ایک اسکول بس پر بچوں کو لانے لے جانے پر مامور رہی تھی اور تاج محل ہوٹل میں لیڈیز کلوک روم کی اٹنڈنٹ کے فرائض انجام دیئے تھے۔ "جب ہم ادھر اپنی میم صاحب کے پاس نوکری کیا تو ہم کو لگا جیسے ہم جنت میں آگیا ہے ـــــ ہمارا میم صاحب بالکل اینجل کی موافق تھا اسی لئے جلدی سے ہیون (HEAVEN) کو چلا گیا"، اس نے ساری کے کونے سے آنسو خشک کئے اور چٹائی پر اکڑوں بیٹھ کر کہتی رہی ـــــ "ہم صاحب میم صاحب کے پاس نوکری کیا تو جوزف کی ڈیتھ کے بعد ہم کو زندگی میں پہلی بار عزت ملا اور ہم کو لگا کہ ہمارے سر پر بھی چھت ہے ـــــ صاحب ہمارا اب بھی بہت خیال کرتا ہے ـــــ صاحب تمہارے ڈیڈی کا بہت ذکر کرتا تھا، جس روز اس کے پاس تمہارا ڈیڈی کا تار آیا کہ تم لوگ اِدھر آتا ہے تو ہمارا صاحب خوشی کے مارے رات کو بہت دیر تک اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا ـــــ اور

اپنے سامنے سارا فلیٹ ہم سے ٹھیک کروا یا ـــ اب تم کو جس چیز کو دل چاہے ہم کو بول دینا۔ ادھر تمہارا آنٹی زندہ نہیں ہے مگر ہم ان کا سرونٹ تو ابھی زندہ ہے ـــــ "

ہم لوگ ناصر چچا کے وہاں کئی دن مقیم رہے۔ صبح سویرے ابا جان اور ناصر چچا سمندر کے رُخ والے برآمدے میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے، جو زیادہ تر میری سمجھ میں نہ آتیں، مگر میں بڑے ذوق و شوق سے ان دونوں کی گفتگو سنتی۔ پٹنہ اسکول کی شاعری۔ غالب کا فارسی کلام، عرفی اور نظیری۔ ملکی سیاست۔ نازی جرمنی کے مسائل۔ واردھا آشرم اور نہ جانے کیا کیا۔

ناصر چچا کے گھر کا بڑا باقاعدہ نظام تھا جسے گریس کسی ماہر ایڈمنسٹریٹر کی مانند خاموشی اور ضابطے سے ڈائریکٹ کرتی تھی۔ صبح صبح کمروں کے گلدانوں میں تازہ پھول لگ جاتے چچا کے سارے پائپ صاف کر کے مختلف میزوں پر راکھ دانیوں کے پاس رکھ دیئے جاتے۔ پالش کے بعد ان کے بوٹ پچھلے برآمدے میں ایک قطار میں موجود ہوتے۔ ناشتے کی میز پر تازہ اخبار رکھے ہوئے ملتے۔ کمروں کا فرش صابن سے دھلتا۔ دروازوں اور دریچوں کی چٹخنیاں براسو سے صاف کی جاتیں۔ سارا گھر آئینے کی طرح بڑا چمکتا رہتا۔ کھانے کے کمرے کے وکٹورین سائیڈ بورڈ پر رنگ برنگے اچار، مربوں اور چٹنیوں کے مرتبان موجود رہتے۔ گھر کا خرچ گریس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بڑی جز رسی سے کام لیتی اور پچھلے زینے پر کھڑے ہو کر سودے والوں سے الجھا کرتی اور کسی گہرے رنگ کی سوتی ساڑھی اور کہنیوں تک پھنسی ہوئی آستینوں والے ہلاؤز میں ملبوس، جوڑے میں پن سجائے ننگے پیر، غلط سلط انگریزی یا بمبئی کی مخصوص اردو بولتی، تندہی اور جانفشانی سے گھر سنبھالنے میں مصروف رہتی ـــــ

وہ چچا کی آنکھیں دیکھتی تھی، اگر چچا کسی کو ناپسند کرتے تھے تو وہ بھی اُس کو منہ نہ لگاتی اور فوراً روکھا سوکھا اور بعض اوقات تحقیر آمیز رویہ اختیار کر لیتی۔ چچا جن لوگوں کو پسند کرتے تھے ان کے لئے گریس کی جان بھی حاضر تھی۔

اتوار کے دن میری عید ہوتی تھی۔ کیونکہ اس دن ڈھیروں باتصویر اخبار اور رسالے آتے تھے۔ برآمدے میں ایک میز پر اخبار اور رسالوں کے انبار سلیقے سے چنے ہوئے ملتے، بمبئی کرانیکل اور اسٹیٹسمین اور ٹائمز آف انڈیا اور السٹریٹڈ ویکلی، ساقی کے سالنامے اور افسانہ نمبر، الہدی

دنوں ٹائمز آف انڈیا کی صد سالہ سالگرہ کا خاص نمبر آیا تھا جس میں سو سال قبل کے جرج گیٹ کی بڑی سی رنگین تصویر تھی کہ انگریز لوگ گھوڑا گاڑیوں اور پالکیوں سے اتر رہے ہیں اور نیٹو لوگ ہاتھ باندھے چاروں طرف کھڑے ہیں۔ میں ان رسالوں کی ورق گردانی کرتی یا پھر سمندر کی لہریں گنا کرتی۔ ناصر چچا کا لڑکا مجھ سے دو تین سال چھوٹا تھا اور میری اس سے دوستی بالکل نہ ہو سکی۔ یوں بھی اپنی عمر سے بڑے لوگوں سے میری زیادہ نبھتی تھی۔ اصغر بہت بدتمیز اور شریر تھا وہ دن بھر گریس کو تنگ کیا کرتا تھا۔ پڑھائی میں اس کا جی بالکل نہیں لگتا تھا۔ گریس اسے ڈانٹتی رہتی ــــ "اصغر ــــ جاؤ اپنا لیسن سیکھو ــــ" اور جواباً وہ اسے طرح طرح سے دق کرنے میں لگا رہتا۔ شاید وہ غیر شعوری طور پر گریس کو پسند بھی نہ کرتا تھا اور اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہوگی کہ گریس کے دل میں اس کے لئے جو شدید حد بہ ملکیت تھا۔ اصغر کا ننھا سا دماغ اس سے بغاوت پر آمادہ رہتا تھا۔

"اصغر کی تربیت بے حد غلط ہو رہی ہے"، ناصر چچا افسوس سے اظہار خیال کرتے۔ "گریسی کے بیجا لاڈ پیار نے اسے بالکل برباد کر دیا ہے۔ مگر میں گریس سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ بیگم مرحومہ اس سے اپنی چھوٹی بہن کی طرح محبت کرتی تھیں۔ اب میں اس کے ساتھ کس دل سے سختی کروں؟"

جب اصغر، ہم جائیں گا۔ ہم کھائیں گا۔ ہم تم کو بولا ــــ قسم کی زبان میں باتیں کرتا تو ابا جان بھی بڑے صدمے سے کہتے "یہ ٹیپا برج اور عظیم آباد کے اس خاندان کا فرزند ہے جو اردو ادب کی تاریخ میں اپنا مقام رکھتا ہے" ــــ

فلیٹ کے پچھواڑے کی عمارت میں فائرمین کے کوارٹرز تھے۔ فائرمین زیادہ تر مرہٹے تھے اور ان میں سے ایک کی بڑی خوش شکل بیوی نوگزی ساڑھی پہنے بالوں میں تازہ بینی سجائے نل کے پاس بیٹھی برتن مانجھا کرتی۔

دو پہر کو میں چپکے سے نیچے اتر جاتی جہاں نچلی منزل پر ناصر چچا کے اسسٹنٹ، مسٹر جیکب ابراہام کا فلیٹ تھا۔ مسٹر ابراہام بنی اسرائیل، یعنی ہندی نژاد یہودی تھے اور ان لوگوں کی مادری زبان مرہٹی تھی۔ جمعہ کے روز مسز ربیکا ابراہام پیتل کی زنجیر میں چھت سے

لٹکتے ہوئے خوبصورت لیمپ کو روشن کر کے تین نصف دائروں کے سروں پر لگی ہوئی چھ موم بتیوں کا مخصوص عبرانی شمعدان جلاتیں اور تورات و زبور کی تلاوت کرتیں۔ ان کے ڈرائنگ روم کی دیوار پر حضرت موسیٰؑ کی ایک بڑی سی رنگین تصویر لگی تھی کہ وہ اپنی قوم کو دریائے نیل کے پار لئے جا رہے ہیں۔ میں اوپر واپس آ کر ابا جان یا ناصر چچا سے یہودیوں کے متعلق سوالات کرتی۔ ایک روز میں نے ایک انگریزی کتاب میں پڑھا ــــ "موسےٰ کی مانند تم نے مجھے قید و بند سے نکالا اور فرعون کی مانند میں تمہارا شکر گزار ہونے سے منکر رہا اور لہٰذا صحرا میں نیست و نابود ہو گیا ــــ" اس کا کیا مطلب ہے؟" میں نے ابا جان سے پوچھا۔

"اس کا مطلب آپ ابھی نہیں سمجھ سکتیں۔ جب بڑی ہو جائیں گی تو سمجھیں گی" ــــ انہوں نے جواب دیا۔

شام کو میں ابا جان اور ناصر چچا کے ساتھ ساحل پر ٹہلتی ہوئی تاج محل ہوٹل اور گیٹ وے آف انڈیا تک جاتی اور منڈیر پر کھڑے ہو کر سامنے سے گزرنے والے پروقار سفید جہازوں کو دیکھا کرتی۔

سڑک پر سے گزرتے ہوئے پارسیوں کے آتش کدے کے آدھے شیر اور آدھے انسان والے مہیب ستون نظر آتے اور برستی بارش میں موٹر یا بس کے شیشوں میں سے مجھے وہ بہت پُراسرار معلوم ہوتے۔ جوہو کے کنارے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ایک عقاب نما بوڑھا پارسی کاؤنٹر پر آئس کریم بیچتا تھا۔ وہ بھی بے حد پُراسرار معلوم ہوتا۔ دنیا مجموعی طور پر بے حد پُراسرار تھی۔

صبح کو اخبار پڑھتے پڑھتے ناصر چچا سر اُٹھا کر مجھ سے کہتے ــــ "اچھا صاحب! یہ بھی ہو گیا ــــ!!"

کچھ بزرگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ بچوں سے ایک بے معنی سا فقرہ دہرا دیتے ہیں جو دوسروں کے لئے بے معنی ہوتا ہے مگر بزرگ اور بچے کے درمیان ایک خفیہ کوڈ کا درجہ رکھتا ہے۔ جن لوگوں کو بچوں سے بہت محبت ہوتی ہے۔ ان کے اور بچوں کے درمیان دوستی کا ایک ان کہا رابطہ موجود رہتا ہے۔ "اچھا صاحب ــــ یہ بھی ہو گیا ــــ

وہ بھی ہو گیا ــــــ" میرا اور ناصر چچا کا خفیہ کوڈ تھا۔

جب چچا میرے لئے کوئی پروگرام بنانے تو چپکے سے کہتے ــــــ" آج تمہیں جُوہو لے جائیں گے۔ وہاں سمندر میں خوب مزے سے اپنے نہانا ــــــ کیوں صاحب ؟"

یا ــــــ" آج سینما چلیں گے "ــــــ

یا ــــــ" آج ہم اور تم تاج چلیں گے۔ خوب مزے سے اپنے ڈٹ کر آئس کریم کھانا ــــــ سمجھے صاحب ؟"

ناصر چچا سے میری دوستی دو سال پرانی تھی۔ دو سال قبل، سردیوں کے زمانے میں ناصر چچا ہمارے ہاں دہرہ دون آئے تھے اور ابا جان کے دوسرے دوستوں کی مانند میری ان سے فوراً دوستی ہو گئی تھی۔ ابا جان کے ان گنت دوستوں میں سے علی گڑھ والے چچا ظفر عمر، چچا عبدالغفار[۱]، چچا مشتاق زاہدی، چچا رضا علی[۲] اور چچا عنایت اللہ[۳] سے میری بہت گاڑھی چھنتی تھی۔ اور اب ان شفیق چچاؤں میں ناصر چچا کا بھی اضافہ ہو گیا تھا جن کو اتنی دور بمبئی میں رہنے کی وجہ سے میں نے پہلے نہ دیکھا تھا۔

شام کو میں ناصر چچا کو ڈالن والا کی خاموش اور معطر سڑکوں پر پیدل قدمی کے لئے لے جاتی اور ایک مستعد گائیڈ کی طرح اپنے نزدیک سارے اہم لینڈ مارک، ان کو دکھلاتی جاتی۔ اپنے واقف کار کتوں، بلیوں اور پرندوں سے ان کا تعارف کراتی اور آس پاس کے مکانوں کے متعلق بے حد اہم اطلاعات انہیں فراہم کرتی" دیکھئے چچا وہ یوکلپٹس کے پیڑ ہیں نا ان کے پیچھے ہماری دوست وملا رہتی ہے اور وہ سامنے عطیہ کا گھر ہے اور چچا وہ پلیا پر انگریز کھڑا ہے نا وہ سخت سنکی ہے اور وہ سامنے مسٹر مکنزی رہتی ہیں۔

---

[۱] قاضی عبدالغفار مرحوم

[۲] سید رضا علی مرحوم، مصنف اعمال نامہ۔

[۳] مولوی عنایت اللہ دہلوی مرحوم۔

چچا معلوم ہے آپ کو میسز مکنہ جی جو ہیں ان کے میاں پادری مکنہ جی کہتے ہیں کہ یہ پاگل ہیں اور یہ تو رات رات بھر باغوں میں گھوما کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ان کو نیند بالکل نہیں آتی اور وہ سارے ڈالن والا میں گھوم کر بروک بانڈ کے خالی ڈبے جمع کیا کرتی ہیں۔

اور فرنچ کٹ داڑھی والے پادری مکنہ جی اپنے ایسیشین کتے کے ساتھ سر جھکائے سامنے سے ٹہلتے ہوئے آتے۔ دو منٹ رک کر ہم لوگوں سے بات کرتے اور آگے چلے جاتے ناصر چچا پھر اپنی ہوا خوری شروع کر دیتے اور میں اچھلتی کودتی ان کے آگے آگے چلتی رہتی۔

چچا کو میں نے بڑے جوش و خروش سے اپنی خفیہ جائے پناہ دکھلائی تھی یہ ہمارے گھر کے عقب میں سرخ رنگ کی ایک دو منزلہ عمارت تھی۔ جس میں ان گنت برجیاں شہ نشیں اور مینارے بنے تھے یہ دراصل مشرقی پنجاب کی کسی چھوٹی سی ریاست کے حکمران کی کوٹھی تھی اور اس کا نام پری محل تھا۔ یہ بالکل سنسان پڑی تھی اور عجیب بات تھی کہ اس کے کمروں کے دروازے کھلے رہتے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے عمرو عیار کے طلسم والے کسی ساحر نے چھومنتر کہہ کر اک رستی بستی محلسرا کو پل کی پل میں اجاڑ دیا ہو اور اس کے دروازے اسی طرح کھلے کے کھلے رہ گئے ہوں۔ میں اکثر اس کے زینوں اور برجیوں پہ چڑھ جاتی اور مجھے مطلق ڈر نہ لگتا۔ کیونکہ ویران ہونے کے باوجود اس مکان میں وحشت نہ تھی۔ ناصر چچا جس روز دہرہ دون آئے میں نے اسی روز ان سے کہا "چلیے آپ کو پری محل دکھلائیں"، اور ان کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی وہاں لے گئی۔ تیز سبز گھاس کے قطعے پر ایستادہ کہ سمس کیک ایسا مکان سناٹے میں ڈوبا، ہمیشہ کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ "یہاں ہم کھیلا کرتے ہیں۔" میں نے اطلاع دی۔ ناصر چچا نے چھڑی پر ٹیک لگا کر اس پر نظر ڈالی ــــ اور کہا ــــ "ہوں ــــ یہ بھی خوب ہے۔"

جب وہ چچا عنایت اللہ سے ملنے گئے تو میں مصر رہی کہ وہ چچا عنایت اللہ کے لکڑی چڑیا خانے کو زیادہ تفصیل سے دیکھیں۔ اس چڑیا خانے کے سارے جانوروں اور پرندوں سے میرے پرانے مراسم تھے۔ چچا عنایت اللہ حسب معمول عجری پر کرسی ڈالے دھوپ میں بیٹھے تھے اور ان کے سامنے میز پر بہت سارے کاغذات رکھے تھے اور انہوں

نے ناصر چچا سے پوچھا تھا۔

"تم آج کل کہاں رہتے ہو؟"

"بمبئی میں ——"

"بمبئی میں کیا کرتے ہو؟"

"آگ سے کھیلتے ہیں" —— ناصر چچا نے جواب دیا تھا۔

اور بمبئی آکر میں نے دیکھا تھا کہ چچا کا کام واقعی بہت خطرناک تھا۔ اکثر رات کو فون کی گھنٹی بجتی اور انہیں آتشزدگی کی کسی بڑی واردات پر معائنہ کے لئے جانا پڑتا۔ ان کے کمرے میں برقی گھنٹی لگی تھی۔ جس کا تعلق فائر بریگیڈ کے دفتر سے تھا وہ اکثر وقت بے وقت لگاتار بجے چلی جاتی اور چچا پل کی پل میں غائب ہو جاتے۔ رات کو چچا اپنا یونیفارم، فل بوٹ اور آہنی خود پلنگ کے برابر کرسی پر رکھ کر سوتے تھے۔ تاکہ خطرے کی گھنٹی بجتے ہی تیار ہو کر فوراً موقع واردات پر پہنچ جائیں۔

ایک روز صبح ناصر چچا ناشتے کی میز پر آئے تو بہت اداس تھے۔

"رات ایک سہ منزلہ عمارت میں آگ لگ گئی اور ایک مولوی صاحب مع اپنے خاندان کے جل کر ختم ہو گئے" انہوں نے ملول آواز میں کہا ——

"میں ان مرحوم کو جانتا تھا۔ بے حد خدا ترس اور نیک بزرگ تھے اور بہت غریب۔ ساری زندگی فقر و فاقے میں، پیٹ کی آگ بجھانے کی تگ و دو میں کٹی اور رات اس قہرناک آگ نے خاتمہ کر دیا —— یہ اللہ میاں کے ہاں کس قسم کا انصاف ہے سجاد ——"
انہوں نے ابا جان سے کہا۔

"اسی عمارت میں ایک سیٹھ رہتا تھا جو شہر کا مشہور بد معاش ہے اور سینکڑوں غریبوں اور مظلوموں کا خون چوس کر اس نے الغاروں دولت جمع کی ہے وہ مع اپنے خاندان کے صحیح و سالم بچ گیا۔ اس پر ذرا آنچ نہ آئی۔ اور مولوی حمید الدین اور ان کے افلاس زدہ بیوی بچے جل کر کوئلہ ہو گئے۔"

گریس اس وقت میز کے سرے پر کھڑی تھی۔ اس نے فوراً زیر لب کچھ پڑھنا شروع کیا اور کمرے سے غائب ہو گئی۔

گریس کی عادت تھی کہ ناصر چچا جب آگ بجھانے نکلتے تو وہ ان کی خیریت کی منت مان کر اپنے کمرے میں جناب مریمؑ کے چھوٹے سے مجسمے کے سامنے ایک موم بتی جلا دیتی۔ اور جب وہ صحیح سلامت واپس آجاتے تو زیر لب جانے کیا کیا بڑبڑا کر دوسری موم بتی جلاتی۔ وہ عام رومن کیتھولک عورتوں کی مانند بے انتہا مذہبی اور خوش عقیدہ تھی۔ اتوار کو گرجا جاتی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ دن بھر جو چھوٹے چھوٹے معرکے اس کی روزمرہ کی زندگی میں ہوتے ان کے سلسلے میں شکایت کرنے یا فوری امداد طلب کرنے کے لئے وہ بھاگی بھاگی جناب مریمؑ کے پاس جاتی اور موم بتی روشن کر کے بآواز بلند کونکنی زبان میں ایک کیتھولک دعا دہراتی اور اپنی مخصوص انگریزی یا اردو میں اس چینی کے مجسمے سے تیز تیز گفتگو کرنے کے بعد آکر اپنے کام میں دوبارہ منہمک ہو جاتی۔

ایک روز وہ صبح سارے میں نعمت خانے کی کنجی تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ کنجی ڈھونڈنے میں لگ گئی۔ جب کنجی نہ ملی تو وہ فوراً اپنے کمرے میں پہنچی موم بتی جلائی اور غصے سے کہنا شروع کیا ــــ

"دیکھو ماں، اگر تم نے دس منٹ کے اندر اندر میری کنجی ڈھونڈ کر نہ دی تو آج سے میری تمہاری دوستی ختم ــــ ہم تمہارے کو بولے دینا ہے۔ صاحب کو لنچ میں دیری ہو جائے گا تو وہ ہماری جان نکال لے گا۔ تمہارا کیا بگڑے گا ــــ تم نے تو کبھی آیا گیری نہیں کی"

اگر ناصر چچا کھانا کھاتے میں کسی روز گریس کی پکائی ہوئی کسی چیز کی تعریف کر دیتے تو وہ فوراً مجسمے کے سامنے جا کر شکریہ کی موم بتی جلاتی۔

ناصر چچا گریس یا دوسرے نوکروں سے شاذ و نادر ہی کوئی غیر ضروری بات کرتے تھے۔ گھر کے معاملات کے سلسلے میں وہ کافی کم سخن تھے اور گریس کو خانہ داری کے سیاہ و سفید کا مالک بنا چکے تھے اور یوں بھی ان کی متاہلانہ زندگی ختم ہوئے اتنا عرصہ گزر گیا تھا کہ انہیں اپنی تنہائی کی عادت ہو گئی تھی اور شاید انہوں نے اپنے خیالوں اور اپنی یادوں کی دوسرا تھ میں خاموشی سے

زندہ رہنا سیکھ لیا تھا۔

ناصر چچا سرخ و سفید، بھاری بھرکم بلند قامت اور کافی رعب وداب والے انسان تھے۔ وہ مالی لحاظ سے بہت خوشحال تھے۔ سرکاری تنخواہ کے علاوہ کلکتے میں ان کی کافی جائداد بھی تھی۔ اور گھر میں برابر اس فکر میں گھلتی رہتی تھی کہ صاحب بڑا فضول خرچی کرتا ہے۔

بمبئی کے مقتدر اور اہم مسلمانوں میں ان کا شمار کیا جاتا تھا وہ متعدد اسلامی اداروں کے سرپرست اور اعزازی عہدے دار تھے اور اپنی نرم دلی، رکھ رکھاؤ اور وضعداری کے لئے مشہور تھے۔

ایک روز تین بھاری بھرکم بیبیاں ذرا ہانپتی کانپتی زینہ چڑھ کر برآمدے میں آئیں اور بڑی تمکنت سے آن کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئیں۔ جب ناصر چچا کمرے میں آئے تو وہ تینوں اٹھیں اور اسی تمکنت سے ان کے قریب پہنچیں۔ ان کی قائد خاتون کے ہاتھ میں دو ڈبے تھے اور بھاری بھاری اطلسی غرارے پہنے فرش پر ایک قطار میں چلتے ہوئے انہیں دیکھ کر مجھے "مشرق کے تین مجوسی بادشاہوں" کا خیال آگیا۔ جو حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے متعلق تصاویر میں منقش لبادوں میں ملبوس ہاتھ میں تحائف اٹھائے ایک قطار میں چلتے دکھائے جاتے ہیں۔ قائد خاتون نے ڈبہ کھول کر ایک تصویر چچا کے ملاحظہ کے لئے پیش کی۔ انہوں نے تصویر کو سرسری نظر سے دیکھا اور میز پر رکھ دیا۔ ان بیبیوں نے تقریباً ایک زبان ہو کر کورس کے سے انداز میں کہا کہ بات طے ہو گئی ہے اور کل شام کو وہ منگنی کی رسم ادا کرنے لڑکی والوں کے گھر جا رہی ہیں۔ پھر انہوں نے ڈبیہ کھول کر ایک انگوٹھی نکالی اور کہا کہ یہ نو تم بھاؤ کے ہاں سے خرید لی ہے اس کے بعد انہوں نے گریس کو آواز دی اور جب وہ کمرے میں آئی تو اس سے کہا کہ گیارہ سیر مٹھائی، گیارہ سیر پھل اور گیارہ سیر خشک میوہ خرید لائے اور کل شام کے پانچ بجے تیار رہے۔ یہ حکم دے کر تینوں بیبیاں اسی طرح سرسراتی ہوئی زینے سے نیچے اتر گئیں۔

یہ تینوں بیبیاں ناصر چچا کے ایک لکھنوی دوست کی بیوی، بھاوج اور بہن تھیں۔ اور ارجمند بھابی، سرفراز دلہن اور جمیلہ بہن کہلاتی تھیں اور کئی برس سے چچا سے مصر تھیں کہ اب ان کو اپنا گھر بسا لینا چاہیئے۔ یہ تینوں چچا کی بہن اور بھاوج بنی ہوئی تھیں اور ان کے خاندان

والیوں کی حیثیت سے انہوں نے لڑکی پسند بھی کر لی تھی اور ناصر چچا کو محض یہ اطلاع دینے آئی تھیں ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم نے اس طرح زبردستی سے کام نہ لیا تو ناصر بھائی ساری عمر اسی طرح گزار دیں گے اور گھر کا گھروا، ہو جاتے گا اور دکھیا اصغر کی جو ربڑ لگے گی وہ الگ۔

ناصر چچا بہت دنوں تک شدت سے انکار کرتے رہے تھے مگر غالباً اصغر کی تربیت کا خیال کرکے انہوں نے اب آن کے حامی بھر لی تھی۔ کیوں کہ لڑکی خاص الخاص لکھنؤ کے ایک ایرانی نژاد خاندان کی تھی اور کم از کم اس کی وجہ سے اصغر کی زبان اور لہجہ تو سدھر جائے گا۔

شام کو انہوں نے ابا جان سے کہا۔

"جمیلہ بہن تو نسبت ہی طے کر آئی ہیں۔ مگر لڑکی والوں کی شرط یہ ہے کہ ساری رسمیں ادا کر دی جائیں۔ یہ سخت چھچھورے پن کی بات ہے لاحول ولا قوۃ ——" پھر انہوں نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ جو حسبِ معمول جنگلے پہ لٹک رہی تھی —— اور کہا —— "کیوں صاحب —— یہ بھی ہو گیا۔"

دوسرے روز گریس بازار سے سارا سامان خرید لائی اور گودام میں جاکر وہ بڑے صندوق کھولے جن میں سعیدہ چچی کا سامان مقفل تھا۔ میں سائے کی طرح گریس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اور بڑے اشتیاق سے ساری تیاریوں کو دیکھ رہی تھی۔ گریس نے صندوق کھول کر گوٹے لچکے کے خوان پوش نکالے —— "یہ میم صاحب نے اپنے ہاتھ سے بنائے تھے" اس نے کہا اور آنسو کا ایک قطرہ پٹ سے سرخ پوتھ کے ایک خوان پوش پر گر گیا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں جاکر تیار ہوئی پھول دار جارجٹ کی ساڑھی پہنی۔ بالوں میں پِنیں سجائیں اور سانولے چہرے پر سفید پاؤڈر لگا کر باہر نکلی۔

"بڑی پیاری ساڑھی ہے گریس ——" میں نے کہا۔

"یہ ہمارا میم صاحب دیا تھا" اس نے نیچی آواز میں کہا "میم صاحب ہمیشہ غرارہ پہنتا تھا۔ اپنا ساڑھی ہم کو دے دیتا تھا۔ ہم نے سب پیٹی میں رکھ چھوڑا ہے ——"

میں بھی ایک گلابی آرگنڈی، پارٹی فراک، پہن بالوں میں ربن لگا، موزے جوتے ڈانٹ چلنے کے لئے مستعد ہو چکی تھی اور دلہن کو دیکھنے کے اشتیاق میں مری جارہی تھی۔

ارجمند بھابی کی بیوک میں سوار ہو کر قافلہ عمر پارک روانہ ہوا۔

لڑکی کے گھر پہنچ کر، ہم لوگ ایک جلوس کی صورت میں زینے کی سمت بڑھے۔ جلوس کی قائد ارجمند بھابی تھیں پیچھے پیچھے گریس نے مٹھائی کا خوان اٹھا رکھا تھا اور جمیلہ بہن کی خادماؤں نے بقیہ کشتیاں اور سینیاں سنبھالی ہوئی تھیں۔ انگوٹھی کی سرخ ڈبیہ سرفراز دلہن کے پرس میں محفوظ تھی۔ دروازے پر لکھنؤ اعزاروں میں ملبوس بہت سی دبلی اور موٹی بیبیوں نے ہمارا استقبال کیا اور اوپر لے گئیں۔

ان کے ذرا اندھیرے سے ڈرائنگ روم میں قسم قسم کا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ شیشے کی ایک بڑی الماری میں چاندی اور ای پی این ایس کے ظروف اور سیلولائیڈ کے بیوے اور دوسرے کھلونے اور سیپیاں اور گھونگے اور چھوٹا سا تاج محل اور خاندان کے سپوتوں کے جیتے ہوئے کپ اور بڑا فیاں اور دوسرا الم غلم اٹا ٹوٹ بھرا تھا۔ کارنس پر سگھڑ بیٹیوں کے ہاتھ کے سیاہ مخمل پہ کاڑھے ہوئے سارس اور طوطے فریموں میں مزین تھے۔ کرسیوں اور صوفوں کے ان گنت ساٹن کے کشنوں پر مزید سارس اور طوطے اور بڑا سا سایہ پہنے چھتری اٹھائے ہوئی ہوکس کے پودے کے پاس کھڑی ہوئی میمیں کڑھی تھیں۔

ہم لوگ صوفے پر بٹھا دیئے گئے۔ گریس دوسری آیاؤں کے ساتھ گیلری میں کھڑی رہی۔ دروازے میں سے اس نے اس کمرے کو ذرا ناقدانہ نگاہوں سے دیکھا۔ کیونکہ ناصر چچا کا جل جل کہ تا ڈرائنگ روم بقول اس کے انگریز لوگ کا گول کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ سعیدہ چچی بے حد خوش ذوق تھیں اور ان کے ہاتھ کی سجائی ہوئی چیزیں گریس نے جوں کی توں اپنی اپنی جگہ پر رکھی رہنے دی تھیں اور اگر کوئی ملازم جھاڑ پونچھ کرنے میں کوئی چیز انچ بھر اس کی جگہ سے سرکا دیتا تو وہ اسے کھانے کو دوڑتی تھی۔

تیکھی نگہ دزدیدہ نگاہوں سے کمرے کا معائنہ کرنے کے بعد گریسی کواڑ سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

ڈرائنگ روم سمدھیانے والیوں سے بھرنا شروع ہوا۔ اور ہجوم کی وجہ سے دم گھٹنے لگا۔ گریس کھڑے کھڑے تھک گئی ہوگی۔ میں نے سوچا اور مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ اجنبیوں کے

اس مجمع میں (اور اجنبیوں میں تینوں مجوسی بادشاہ یعنی ارجمند بھابی۔ سرفراز دلہن اور جمیلہ بہن بھی شامل تھیں) مجھے گہ بیسی اچانک بے حد "اپنی" معلوم ہوئی اور میرا جی چاہا کہ اس کی دوسرا تھ کے لئے جاکر اس کے پاس گیلری میں کھڑی ہو جاؤں۔ آخر میں نے اس سے کہا ——— "گہ بیس ادھر آکہ بیٹھ جاؤ۔" وہ دروازے کے قریب ایک کرسی پر اس طرح ٹک گئی جیسے جلتی ہوئی انگیٹھی کے کنارے پر بیٹھی ہو اور اندر ہی اندر کھول رہی ہو۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ گہ بیس کو اتنا غصہ کیوں آرہا ہے۔ اتنے میں بجلی فیل ہو گئی اور برقی پنکھا بند ہو جانے کی وجہ سے حبس بڑھ گیا۔ خواتین اصغر علی محمد علی کے وہاں کی خوشبوؤں سے مہک رہی تھیں۔ ان کی گودیوں میں ٹھنسے ہوئے بچے گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہے تھے۔ ستورو غل اور گرمی کی وجہ سے جی لوٹا جارہا تھا۔ مگر ابھی چھم چھم کرتی دلہن آنے والی تھی۔ اور اس کے بعد آئس کریم آئے گی میں دونوں چیزوں کے انتظار میں صبر سے بیٹھی رہی۔ اتنے میں ایک دم ایک لمحہ کے لئے سناٹا سا ہو گیا اور "لڑکی" (جو دراصل بہت لمبی چوڑی، لحیم شحیم، گوری چٹی پینتیس سالہ مجرد خاتون تھیں) سر ذرا سا خم کئے اطمینان سے سیٹر سیٹر چلتی آکہ دھم سے بیٹھ گئی اور صوفے کے اسپرنگ بج اُٹھے۔

"ارے گہ بیسی۔ ادھر آ ———" جمیلہ بہن نے آواز دی "ذرا مصری کی تھالی تو لانا۔"

گہ بیس نے خاموشی سے ایک گنگا جمنی تھالی پیش کی اور اس پر سے مصری کی ڈلی اُٹھا کہ جمیلہ بہن نے مولا کا نام لیا اور پان اور ڈلی لڑکی کے منہ میں رکھی امام ضامن باندھا۔ اور انگوٹھی پہنائی۔ لڑکی ساری کارروائیاں ٹکر ٹکر دیکھا کی اور چند منٹ بعد اُٹھ کر اسی طرح سیٹر سیٹر کرتی کمرے سے چلی گئی۔

مجھے بڑی سخت مایوسی ہوئی۔ کیونکہ اپنے وہاں جتنی منگنیاں اور شادیاں میں نے دیکھی تھیں ان میں دلہنیں شرم کے مارے بالکل دوہری ہو ئی جاتی تھیں۔

میزبان خواتین چائے کے انتظامات میں مصروف ہوئیں اور تینوں مجوسی بادشاہ فوراً آپس میں کھسر پھسر میں منہمک ہو گئے۔

"رنگت تو اجلی ہے مگر ہے پھیکی سلجم" ارجمند بھابی نے کہا۔

"اس غریب کی بیاہ کی عمر ہی نکل چکی ہے۔ میں کہے دیتی ہوں۔ چالیس کے پیٹے میں ہے"
سرفراز دلہن نے کہا۔

"دلہن کی باتیں چوبیس سال کی ہوگی حد سے حد دکھیا"

"چونڈہ تو سفید ہو چلا ہے۔ دکھتی ہے چوبیس سال کی" سرفراز دلہن نے کہا۔

"اسے نہیں۔ نگوڑی اچھی خاصی ہے۔ اسے ہاں اور کیا —— شریف لوگ ہیں۔ شیعہ۔ سید۔ دیکھے بھالے" ارجمند بھابی نے کہا۔

"یہ تو ہئی ہے اور پھر یہ کہ جو بندھ گیا سو موتی۔ راجہ کے گھر آئے رانی کہلائے" سرفراز دلہن نے کہا۔

"دیکھ لینا ناصر بھائی پلکوں کی چھاؤں میں رکھیں گے" ارجمند بھابی نے کہا۔

"یہ تو ہی ہے۔ جسے پیا چاہیں وہی سہاگن" سرفراز دلہن نے کہا۔

چائے آئی اور اب شرائط کا قضیہ شروع ہوا۔

"ہم نے نواب زادہ صاحب کو کہلوا دیا ہے۔ مہر ایک لاکھ سے کم نہیں بندھے گا" لڑکی کی ماں نے کہا۔

"اے بہن کیا غضب کرتی ہیں۔ ایک لاکھ ——" ارجمند بھابی نے کہا۔

"ہمارے کے یہاں تو بہن شرعی مہر بندھتا ہے" سرفراز دلہن نے کہا۔

"اور پاندان کا خرچ پچاس روپے مہینہ ——" لڑکی کی خالہ نے کہا۔

"ہمارے کے یہاں تو بہن شرطیں ہی نہیں ہوتیں ——" ارجمند بھابی نے کہا۔

اب تمام حاضرین محفل نے ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا اور بڑا غل مچا۔ بچے اور زور زور سے رونے لگے۔ حبس بڑھتا گیا اور مجھے اتنی گرمی اور حبس کی وجہ سے یک لخت چکر سا آگیا اور میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ میری سراسیمگی دیکھ کر گریس آگے بڑھی اور اس نے اونچی آواز میں مضبوطی سے اعلان کیا ——

"میم صاحب —— ہماری با با گھر جانا مانگتا ہے"

تینوں مجوسی بادشاہ پاندان کے خرچ اور مہروں کے جھگڑے میں اس قدر پھنس چکے

تھے کہ انہوں نے بھی فرار مناسب سمجھا۔

ارجمند بھابی دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اُٹھیں "اچھا تو میں اِن کو ——— جمیلہ کے بھائی کو — میرا مطلب ہے اپنے اُن کو ——— اپنے مسٹر کو بھیجوں گی۔ وہ آپ کے صاحب سے بات کرتے ہیں گے ——— نواب زادہ صاحب نے ——— ہمارے ناصر بھائی نے تو سارا معاملہ ہم پر چھوڑ دیا ہے۔"

ارجمند بھابی نے سمدھنوں سے کہا۔

جلوس زینہ اتر کر نیچے پہنچا۔

"اچھا بہن خدا حافظ"

"اللہ نگہبان"

"مہروں کا جو فیصلہ ہوا اطلاع جلد بھجوا دیجئے گا ——— اور بھی بچی کے بے شمار پیغام تھے، مگر ہم تو خاندان دیکھتے ہیں ———"

"اللہ حافظ ——— اللہ حافظ ———"

جلوس ناصر چچا کے گھر واپس پہنچا۔ ابّا جان چند روز کے لئے کسی کام سے مدراس جا چکے تھے۔ چچا برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ اصغر ایک کونے میں بیٹھا مکینّو سے کھیل رہا تھا۔

"اے مبارک ہو ناصر بھائی ———" ارجمند بھابی نے زینے ہی پر سے آواز دی۔ ماشاءاللہ سے چاند سی دلہن ملی ہے۔"

برآمدے میں پہنچ کر تینوں بیبیوں نے تقریباً یک زبان کہنا شروع کیا۔

"سگھڑ ایسی کہ دسوں انگلیاں دسو چراغ ——— اس کی کشیدہ کاری دیکھی تم نے دلہن؟ میں کہتی ہوں اس اجڑے گھر میں چار چاند لگا دے گی۔ کیوں دلہن؟" ارجمند بھابی نے کہا۔

"یہ تو ہئی ہے،" سرفراز دلہن نے کہا۔

"اور لڑکی کے باپ جہیز میں موٹر دینے کو کہہ رہے ہیں ———" جمیلہ بہن نے کہا۔

"بس اب وہ جھم جھم اس گھر میں آ کر اُترے ——— ہم تو اپنے بھائی کی خوشی چاہتے ہیں۔

ارجمند بھابی نے کہا ـــــ۔

"یہ تو ہئی ہے ـــــ" سرفراز دلہن نے کہا۔

ناصر چچا سگار کی راکھ جھاڑ کر مسکرائے اور تینوں بیبیوں کی اس گفتگو سے بہت محظوظ نظر آئے۔ ناصر چچا شدید سنس آف ہیومر کے مالک تھے۔

گریس خوان پوش اور سینیاں واپس رکھنے کے لئے گودام کی طرف جا چکی تھی۔

اس رات چچا کہیں ملنے ملانے چلے گئے۔ علی اصغر اپنے کمرے میں سو چکا تھا میں سارے گھر میں اِدھر اُدھر گھومتی پھری۔ چچا کے البم کی ساری تصویریں دوبارہ دیکھ ڈالیں جن میں سے ایک بہت پیاری سی شکل کی سعیدہ چچی نفیس غرارے میں ملبوس، گودی میں علی اصغر کو اُٹھائے کھڑی تھیں۔ با گریس علی اصغر کو بچہ گاڑی میں بٹھال رہی تھی اور سعیدہ چچی پاس کھڑی ہنس رہی تھیں۔ دارجلنگ، کلکتہ۔ مہابلیشور۔ پونا۔ ہر جگہ ناصر چچا اور سعیدہ چچی اکٹھے اور کس قدر مسرور نظر آ رہے تھے۔

دفعتاً گریس کے کمرے کی طرف سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی جانور غرّا رہا ہو۔ عجیب غیر انسانی سی آواز۔ میں جلدی سے پچھلے برآمدے میں سے نکل کر ادھر گئی اور گریس کے کمرے کی کھڑکی میں جھانکا ـــــ جناب مریمؑ کا مجسمہ گریس کے پلنگ کے سرہانے ایک چھوٹی سی میز پر رکھا رہتا تھا۔ اس وقت گریس اس کے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی اور ہل ہل کر آگ برساتی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"یُو سوائنڈ سو ـــــ ہم تمہارے دیول میں اکھّا نو ہفتے کا نوینا[1] بنایا۔ تمہارا دیول کا چکر لگاتے لگاتے ہمارا پاؤں تھک گیا۔ تمہاری پہاڑیوں کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ہمارا جان نکل گیا۔ روزبری[2] کرتے کرتے ہمارا چکرا گیا۔ ہمارا کھوپڑی پلپلا ہو گیا۔ ہمارا مگج گھوم گیا اور تم نے ہمارے ساتھ فور ٹوینٹی کیا۔ تم ایک دم کنڈم ہے ـــــ تم اور تمہارا دلارا بیٹا دونوں کنڈم ـــــ ڈیم فراڈ ـــــ دیکھ لی تمہاری خدائی "کو" اینڈ "بیٹا" اینڈ "مرسی"" اس نے زور سے پھونک مار کر

---

[2] ROSARY [1] NOVENA

شمع بجھا دی اور بڑے استہزا اور حقارت سے منہ چڑا کر بولی ـــــ "بڑی درجن میری بنتی ہے درجن میری۔ درجن میری ـــــ"، پھر اس نے اپنا سر میز کے کنارے پر رگڑنا شروع کر دیا۔

اس کا چہرہ بدلا ہوا تھا، جیسے وہ شدید اندرونی جسمانی کرب میں مبتلا ہو۔ میں ڈر سی گئی۔ یہ کوئی دوسری کرسٹی تھی۔ یہ وہ کرسٹی نہیں تھی جو بڑے پیار سے میرے فراکوں پر استری کرتی تھی۔ مجھے اپنے ساتھ بازار لے جاتی تھی اور میرے لئے چاکلیٹ خریدتی تھی جو رات کو مجھے گوا کی لوک کہانیاں کونکنی گاتے اور پرتگالی دھن میں گوا کے لوک گیت سناتی تھی۔ یہ کوئی دیوانی تھی۔ یا کوئی ایسی بدروح جسے سخت ترین سزا دی گئی ہو اور جس کے جسم پر کوڑے لگائے جا رہے ہوں مگر وہ کوڑے نظر نہ آتے ہوں۔

کوڑے مجھے بھی نظر نہ آئے، لیکن اتنا احساس ضرور ہوا کہ اسے بہت شدید تکلیف ہے۔ درد قولنج یا اپنڈی سائیٹس کا دورہ پڑا ہے، کیونکہ ایسا ستا ہوا اور انتہائی اذیت میں مبتلا چہرہ میں نے لکھنؤ میں ایک مرتبہ اپنی ایک کزن کا دیکھا تھا، جنہیں اپنڈی سائیٹس ہوا تھا۔

جناب مریمؑ سے اس کے جس قسم کے بے تکلف تعلقات تھے، ان کو دیکھتے ہوئے اس کا یہ غصہ تو جائز تھا مگر وہ تو جناب مریمؑ کو باقاعدہ گالیاں دے رہی تھی! ـــــ مجھے اور زیادہ ڈر لگا۔ اب کرسٹی کے سر پہ چھت گر پڑے گی۔ وہ حضرت مریم علیہ السلام کی شان میں گستاخی کر رہی ہے۔

پھر مجھے فوراً خیال آیا کہ اس بے وقوف کو چاہیئے کہ ڈاکٹر کو فون کرے۔ حضرت مریمؑ ڈاکٹر تو ہیں نہیں کہ میز پر گڑیا ایسی کھڑی کھڑی اسے نسخہ لکھ کر دے دیں گی۔

میں کھڑکی میں منجمد اور پریشان کھڑی رہی۔ دفعتاً مجھے نچلی منزل والی مسز ربیکا ابراہام کی بات یاد آئی، جنہوں نے کل ہی مجھ سے کہا تھا کہ عیسائیوں کا یہ عیسیٰ و مریم کا چکر بڑا سخت گناہ ہے۔ عیسائیوں نے سچے دین موسیٰؑ کو مسخ کر کے۔ خدائے واحد کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جو شدید کفر کی بات ہے اور شرک گناہ عظیم ہے اور اسی وجہ سے یہ سارے مشرکین سیدھے جہنم میں جائیں گے۔

"کرسٹی بھی جہنم میں جائے گی؟"، میں نے فکرمند ہو کر پوچھا تھا۔

"ہاں اگر وہ راہ راست پر نہ آئی اور عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا اور خدا مانتی رہی تو دوزخ کے علاوہ اس کا ٹھکانہ اور کہیں نہیں ہے۔ خدا کے منتخب بندے صرف بنی اسرائیل ہیں،،

میں گریس کے اس خوفناک مستقبل کے مسئلہ پر ابا جان یا ناصر چچا سے سوالات کرنے ہی والی تھی کہ ابا جان مدراس چلے گئے اور گھر میں منگنی کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔

میں دہشت زدہ سی دریچے کے باہر کھڑی رہی اور سمجھ میں نہ آیا کہ گریسی کی کس طرح مدد کروں۔

اب اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ رہا تھا اور وہ پرسکون آواز میں آہستہ آہستہ انگریزی میں کہہ رہی تھی ــــ "ماں ــــ تم مزے سے مسکراتے جا رہی ہو ــــ تم تو بیس برس کی عمر میں بیوہ نہیں ہوئیں ــــ تم تو جانتی ہی نہیں کہ آدمی کا پیار کیسا ہوتا ہے تم نے تو دس برس تک درد کی ٹھوکریں نہیں کھائیں۔ تم تو فٹ پاتھ پر کبھی نہیں سوئیں۔ تمہیں کیا پتہ کہ سیکیورٹی اور گھر اور پوزیشن کا کیا مطلب ہے؟

"تمہارے اکلوتے بیٹے پر تو کوئی سوتیلی ماں نہیں آئی۔ تم کو پتہ بھی نہیں سوتیلی ماں کیسی ہوتی ہے ــــ مدر ــــ دیو اچے مائے ــــ دیوا چے مائے[1]،، اس نے اپنے ہاتھ میز پر پھیلا کر مجسمہ بانہوں کے حلقے میں لے لیا اور اس کے ننھے منے سفید پیروں پر سر رکھ کر چپ ہو گئی۔

میں کھڑکی میں سے ہٹ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کہ یہ سب کیا ہے۔ دنیا واقعی حد سے زیادہ پراسرار تھی۔ پھر میں نے رابعہ آپا اور رضوان بھائی کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ جو میرے بڑے محبت والے اور دلچسپ کرن تھے اور جن کے گھر میں صبح کو جانے والی تھی۔ خوش ہو ہو کر یہ سوچتے ہوئے کہ مانگا میں کتنے مزے آئیں گے تھوڑی دیر بعد میں سو گئی۔

دوسرے روز صبح سویرے رابعہ آپا اور رضوان بھائی مجھے اپنے وہاں مانگا لے گئے

---

[1] خدا کی ماں

یہ ایک نوجوان جوڑا تھا اور ان کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی ان کے وہاں ہر وقت ان کے ہم عمر دوستوں کا مجمع رہتا اور خوب ہُوحق ہوتی۔ ان کا چھوٹا سا فلیٹ ناصر چچا کے خاموش مکان کے مقابلہ میں بہت پر رونق تھا۔ پڑوس میں ایک نامور فلمی اداکار کا گھر تھا جس کے دو موٹے موٹے لڑکے سامنے خاموش سڑک پر رولر اسکیٹنگ کیا کرتے اور ان کا پشاوری ملازم گل لینے میں کھاٹ پر لیٹا حقہ گڑگڑایا کرتا اور بچوں کو ڈانٹتا رہتا۔ دوپہر کو سڑک کے آمنے سامنے ساری رہائشی عمارتوں میں ایک ساتھ ریڈیو پر فلمی ریکارڈ بجتے۔

اور کانن دیوی کی سریلی آواز سارے میں گونجتی "من میرے آندھی بن جائے ۔ اور --- "تم من موہن --- تم سکھین سنگ ہنس ہنس کھیلو پھاگ --- میری دنیا سونی کر کے بستی نئی بسائی تو نے --- اب میں جا کے کسے سناؤں اپنے من کا راگ ---" اور برابر کے فلیٹ میں ایک سکھ لڑکی ان ریکارڈوں کے ساتھ ساتھ آواز ملا کر گایا کرتی۔

چند روز بعد ابّا جان مدراس سے لوٹ کر ماٹنگا آ گئے اور اس کے اگلے ہفتے جب ہم ناصر چچا کے گھر واپس پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہاں ایک کرائسس آ کر گزر چکا ہے۔

اس وقت شام کے پانچ بجے تھے۔ برآمدے میں ارجمند بھابی۔ سرفراز دلہن اور جمیلہ بہن بید کی کرسیوں پر براجمان تھیں۔ گنہ بسی ساڑھی کا پلّو کمر میں کھونسے دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ ناصر چچا حسبِ عادت پائپ ہاتھ میں لئے ادھر سے اُدھر ٹہل رہے تھے۔

ارجمند بھابی کہہ رہی تھیں --- "اے میں تو کہتی ہوں اللہ کا شکر ہے کہ ہزار پانچسو ہی سے ماتھے گئی۔ اگر کہیں خدانخواستہ دو بول پڑھا لئے ہوتے اور پھر یہ معلوم ہوتا تو ناصر بھائی کیا کچہری چڑھتے۔ خدانخواستہ۔ الٹی آنتیں گلے پڑ جاتیں۔ شریفوں میں چھٹم چھٹا، فارغ خطی، خلع طلاق کے ٹنٹوں کا کسے دماغ ہے ---"

"جبھی تو میں کہوں کہ اس کی ماں ایک لاکھ مہر پر کیوں اڑی ہوئی تھیں"، سرفراز دلہن نے کہا۔

ابّا جان کو اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر ناصر چچا نے آواز دی --- "ارے بھائی۔ وہ شادی ہماری --- القط ہو گئی"

"ام نے --- کیوں؟ خیریت؟"، ابّا جان نے ٹھٹھک کر پوچھا۔

"لڑکی کو مالی خو لیا ہے،" ناصر چچا نے مختصراً جواب دیا۔

"اوہو ـــ بڑا افسوس ہوا ـــ،" ابا جان بولے۔

"لڑکی کو ہسٹریا کے دورے پڑتے ہیں بھائی صاحب ـــ"

ارجمند بھابی نے سر پہ دوپٹہ سنوارتے ہوئے ابا جان سے وضاحت کی۔" ان لوگوں نے چھپا رکھا تھا۔ میں نے جو ٹوہ لگائی تو معتبر ذرائع سے پتہ چل گیا ـــ بڑی اللہ قسم خیریت ہو گئی۔ میں تو ناصر بھائی سے کہہ رہی ہوں کہ شکرانے کی مجلس کروائیں۔"

"میرا تو پہلے ہی شادی کا ارادہ نہیں تھا۔ یہی لوگ پیچھے پڑی تھیں۔ اب کہتی ہیں لڑکی بالکل تلتیا مرچ ہے اور ہسٹریا کی مریض بھی ہے تو بھی ممکن ہے یہ اطلاع غلط ہی ہو۔ مگر میں اس عمر میں آن کر یہ RISK نہیں لے سکتا ـــ یہ میرے ساتھ بھی بے انصافی ہو گی اور اس لڑکی کے ساتھ بھی ـــ"

ابا جان ہاتھ منہ دھونے کے لئے اندر چلے گئے۔

ارجمند بھابی نے سلسلہ گفتگو جاری رکھا ـــ "میں بڑی چیز اُٹھا کہ آپ سے کہتی ہوں ناصر بھائی مجھے نہایت ہی معتبر ذرائع سے یہ معلوم ہوا ہے ـــ"

"جبھی تو میں کہوں کہ اس روز اس کی شکل پر کیسی وحشت برس رہی تھی بلکہ وحشت کیا ایک قسم کی نحوست ـــ ٹھپکا رہ ایک دم ـــ" سرفراز دلہن نے کہا۔

"اور شکل بھی کیا تھی ـــ بس رنگ ہی رنگ تھا۔ طباق ایسا منہ بلّی ایسی بالکل۔" جمیلہ بہن نے کہا۔

"اور ڈیل ڈول دیکھا کیسا بے ہنگم تھا؟ پھاوڑا ایسے پاؤں۔ کھرڑا ایسے ہاتھ۔ بے حیائی دیکھو کہ گھونگھٹ تک نہ کاڑھا۔ بیلی میں رہ کر بالکل میم بن گئیں ـــ لُوکا لگاؤں ایسی عورت کو میں ـــ،" سرفراز دلہن نے کہا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اسی لڑکی کو یہ لوگ اس روز چندے آفتاب چندے ماہتاب

ﻟﮯ قرآن شریف

بتا رہی تھیں جس کی دسوں انگلیاں دسوں چراغ تھے اور آج اس میں اتنے کیڑے کیسے پڑ گئے۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

"ملکہ بھابی ——" جمیلہ بہن کہہ رہی تھیں —— "اس وقت تو منگنی کے وقت تو وہ بالکل اچھی بھلی بیٹھی تھی۔"

"اسے دُوئی —— تو کیا سب کے سامنے رونے چلّانے لگتی؟ ہسٹریا کے مریضوں کے سر پہ سینگ تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ کسی ایک ذرا سی بات سے پتہ چل جاتا ہے۔ اب جب اسے معلوم ہوگا کہ نسبت ٹوٹ گئی تو زمین آسمان ایک کر دے گی —— اللہ توبہ توبہ توبہ —— خدا بری گھڑی سے بچائے بہن میرے آگے بھی لڑکیاں ہیں ——" ارجمند بھابی نے جواب دیا۔

"یہ تو ہی ہے —— اور اس کی اماں خالہ بھی اسی لئے یہ بات چھپائے تھیں۔ اس کی خوش مزاجی ہی کی تعریفیں کر رہی تھیں۔ سچ ہے بہن کنجڑن اپنے بیر کھٹے نہیں بتاتی" سرفراز دلہن نے کہا۔

"جھلسا لگاؤں میں تو ——" جمیلہ بہن نے کہا۔

"جبھی تو میں کہوں کہ اتنے دن شادی کیوں نہ ہوئی" سرفراز دلہن نے کہا۔

"اے میں تو کبھی کھٹک گئی تھی کہ چونتیس پینتیس برس کی عمر ہوگی اور کنواری بیٹھی ہے کوئی تو فی ہوگی لڑکی میں۔ لو اب عقدہ کھل گیا۔ ورنہ اتنا دولت مند باپ اور اچھی خاصی صورت تو کوارکوٹلہ یونہی چُنتا رہا؟" جمیلہ بہن نے کہا۔

"بڑا غضب ہو جاتا —— اے بی آدمی گھر بساتا ہے۔ اپنے سکھ چین کے لئے نہ یہ کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔ نیم خبطی بیوی پلّے پڑ جائے۔ موئی عمر بھر کا روگ ——" ارجمند بھابی نے کہا۔

"بال بال بچ گئے ناصر بھائی۔" سرفراز دلہن نے کہا۔

"اچھا بھابی اب اس قصے کو یہیں ختم کرنا چاہیئے۔ اب اس کے متعلق زیادہ تبادلہ خیالات کرنے کی ضرورت نہیں۔" ناصر چچا نے متانت سے کہا اور اپنے کمرے کی طرف

چلے گئے۔

"اے بی گریسی"، ارجمند بھابی نے ذرا پُراسرار انداز میں کھنکار کر آواز دی —— ذرا ایک گلاس پانی تو پلانا۔"

گریس پانی کا جگ اور گلاس لے کر آئی۔ خواتین ناصر چچا کی منگنی اور متعلقہ مسائل پر بدستور زور و شور سے اظہارِ خیال کرتی رہیں۔ اب وہ تین موٹی تازی لیگ ہارن مرغیوں کی مانند بڑی طمانیت سے کلک کلک کر رہی تھیں۔

شام کو میں ابا جان کے ساتھ گھومنے کے لئے چلی گئی۔ ایک بک اسٹال سے مکی ہاؤس کے رسالے خریدے اور خوش خوش واپس لوٹی۔

رات کو ابا جان اور ناصر چچا کہیں دعوت میں چلے گئے اور مجھ سے کہتے گئے کہ میں گریسی کو بلا کر اپنے پاس بٹھالوں۔ مون سون کی جھڑی کئی دن سے لگی ہوئی تھی اور اس وقت باد و باراں کا شور زیادہ تیز ہو گیا تھا۔ علی اصغر چچا کے کمرے میں سوتا تھا اور گریسی اسے سُلا کر اپنے کمرے کی طرف جا چکی تھی۔ میں مکی ہاؤس کے رسالے پڑھنے میں محو تھی اور باہر برستی ہوئی بارش کے مقابلے میں اونچی دیواروں اور عنابی پردوں والے اس وسیع اور آرام دہ کمرے میں، چمڑے کے گدیلوں والی آرام کرسی پر بیٹھی مکی ہاؤس پڑھتی خود کو بے حد محفوظ محسوس کر رہی تھی۔

لیکن کچھ دیر بعد طوفان کا زور بڑھ گیا تو کھڑکیاں بند کروانے کے لئے میں نے گریسی کو آواز دی۔

کوئی جواب نہ ملا تو پچھلے برآمدے سے گزرتی اس کے کمرے میں پہنچی۔ سمندر پر بجلی بار بار چمک رہی تھی۔

گریسی کے مختصر سے کمرے میں داخل ہو کر دفعتاً ایسا لگا جیسے طوفان میں گھرے ہوئے جہاز کے عرشے پر سے ہٹ کر پُرسکون بند کیبن میں آ گئی ہوں۔ ہیل میری فل اُف گریس —— کمرے میں گریس کی آواز گونجی۔ پھر اس نے کوکنی میں HAIL MARY شروع کیا۔

۱؎ HAIL MARY, FULL OF GRACE

"من مورے کریں پھر لیلے سوامی دیوتجے" سنگاتی آسا ـــــ"

وہ موم بتیاں جلاتی گئی اور ہل ہل کر کہتی گئی ـــــ "ماں تم ایک دم فرسٹ کلاس ہو ماں ـــــ تم نے ہمارا نو دینا قبول کر لیا ماں ـــــ سنتا مور بے دیوا چے مائے آمی با پیا کھاتر دنئی کر ـــــ آبین ـــــ ان آنم باپا انی پترا اسپرتیا سنتا چے ـــــ آمین ـــــ"

میرے قدموں کی آہٹ پر وہ چونک کر پیچھے مڑی اور مجھے دیکھ کر ذرا گھبرا گئی اور غصّے سے کہا ـــــ "تم اس ٹائم ادھر کیا کرنے آیا ہے ۔ جا کر سو جاؤ ـــــ"

"سمندر میں طوفان آ رہا ہے گریسی۔ میں تمہیں بلانے آئی تھی کہ چل کر میرے کمرے میں بیٹھو ـــــ" میں نے لجاجت سے کہا۔

دفعتاً شفقت اور محبت کا سیلاب اس کی آنکھوں سے اُمنڈ پڑا۔

"کم ہیر ڈارلنگ ـــــ" اس نے خالص میموں والے لہجے میں کہا ـــــ اور مجھے پچکار کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "ٹافی مانگتا ـــــ؟"

"یس پلیز ـ گریسی۔"

وہ اٹھی اور الماری میں سے "بلیک میجک" کا ڈبہ نکالا۔

ٹافی کی ڈلی منہ میں ڈالتے ہوئے میں نے سوال کیا ـــــ

"گریسی ـــــ نو دینا کیا ہوتا ہے ـــــ؟"

"اوہ یو ڈیم نوزی پارکر[1] ـــــ" اس نے مصنوعی خفگی سے کہا اور یک لخت بڑی پریشان نظر آئی۔

"نہیں ـــــ ہمیں ضرور بتاؤ گریسی ـــــ ہم بھی نو دینا کریں گے۔"

"اچھا ہم تم کو بتلائے گا۔ بٹ، تم پرومس کرو کہ کسی نہیں بولے گا۔"

"پرومس گریسی ـ!"

"اچھا۔ ادھر باندرہ پر ماؤنٹ میری ہے نا ـــــ ادھر ہم لوگوں کا بہت بڑا دیول ہے

---

[1] NOSEY PARKER

ادھر جاکہ پریئر کرو تو ورجن دعا سن لیتا ہے اور ہاہم میں ایک اور دیول ہے چرچ آف سینٹ مائیکل ـــــ اس میں ورجن کا ایک فوٹو ہے اینڈ وہ فوٹو مریکل[1] کرتا ہے ـــــ"

"مریکل ـــــ گریسی ـــــ؟"

"یس ـــــ ادھر تم پورا نوبدھ وازنک جاکہ دعا مانگے تو تمہارا وِش پورا ہو جائے گا۔ ہم نے نووینا چالو کیا اور نائن ویڈنس ڈے پورا کیا۔ پچھلے دن ہم ورجن سے گسّہ ہو گیا تھا۔ مگر ورجن نے ہمارے لئے مریکل کر دیا۔"

"مریکل ـــــ گریسی ـــــ؟"

"چلو ـــــ چلو ـــــ" اس نے سرعت سے کہا ـــــ "اپنے پلنگ میں جاؤ ـــــ بہت لیٹ ہو گیا۔" پھر اس نے اپنی جتاتی انگریزی شروع کر دی جب وہ بہت غصّے میں یا بہت خوش ہوتی تھی تو اپنی بے نقط کی اڑنگ بڑنگ انگریزی بولتی تھی۔ اس وقت وہ بے انتہا مسرور اور مطمئن نظر آرہی تھی۔

"اچھا۔ مگر کل تم بتاؤ گی کہ مریکل کیسا ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔ اس نے میری بات کاٹ دی اور میرے ساتھ ساتھ بیڈ روم کی طرف چلنے لگی۔ کمرے میں آکر اس نے دریچے بند کئے۔ میرے صبح کے کپڑے نکال کر کرسی پر رکھے اور پلنگ کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔

مجھے خیال آیا کہ اسے اس وقت اپنی ڈیوٹی بجالانے کے لئے میرے پاس بیٹھنا پڑ رہا ہے اور میں نے سوچا کہ ہم مسلمانوں کی نماز میں کوئی مخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں جاکہ گریس کی نماز میں مخل ہو گئی تھی اور یہ اس کی بے حد اہم نماز تھی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس رات کی گستاخی کے بعد آج حضرت مریمؑ سے معافی چاہ رہی تھی۔

جوتے اور موزے اتارتے ہوئے میں نے کہا ـــــ "گریسی ـــــ اب مجھے بالکل ڈر نہیں لگ رہا۔ تم جاکہ اپنی پریئر کرو ـــــ"

"نو ـــــ نو ـــــ"

"گڈ نائٹ گریسی ـــــ" میں نے مسہری پر لیٹ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

---

[1] MIRACLE

"آر یو شیور ___؟ کین آئی گو ___؟"

"گڈ نائٹ گریسی ___"

اس رات ٹوٹ کر بارش ہوئی اور سمندر کسی مہیب جانور کی طرح چنگھاڑتا رہا۔ سمندر کی آواز خوفناک تھی۔ میں نے چادر کو اچھی طرح اوڑھ لپیٹ لیا اور جب ابّا جان دعوت سے واپس آئے میں گہری نیند سو چکی تھی۔

صبح کو ہر چیز دھلی دھلائی اور نکھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ سمندر پر سکون تھا اور بے حد نیلا۔ دو پی اینڈ او کا ایک بے حد طویل اور بے حد سفید جہاز وقار سے تیرتا ہوا لہروں پر گزر رہا تھا۔ نیچے سڑک پر مچھلی والیوں نے آوازیں لگانی شروع کر دی تھیں۔ کوارٹروں میں فائرمین کی خوب صورت بیوی پانی کے نل کے پاس کھڑی آسمان پر پھیلی ہوئی مون سون کی گھٹاؤں کو دیکھ رہی تھی۔ اور آپ سے آپ مسکرا رہی تھی۔ سامنے کے برآمدے میں تازہ اخبار آ گئے تھے ابّا جان اور ناصر چچا آرام کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے اور گریسی حسبِ معمول اطمینان اور مصروفیت سے کھانے کے کمرے میں سٹرپٹر کر رہی تھی اور ناصر چچا سے پوچھ رہی تھی کہ ٹرین میں ساتھ لے جانے کے لئے کیا ٹفن بنے گا ___ اگلے ہفتے میرا اسکول کھلنے والا تھا اور سہ پہر کی ٹرین سے ابّا جان اور میں لکھنؤ واپس جا رہے تھے۔

• میں تیار ہو کر برآمدے میں آئی تو ناصر چچا نے اخبار اپنے چہرے کے سامنے سے ہٹا لیا ___ عینک اتار کر میز پر رکھی اور شگفتگی سے پوچھا ___ "کہئے صاحب، یہ بھی ہو گیا ___؟"

پاکستان بنے ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ ۱۹۴۸ء کے آخر میں میں لاہور گئی تو معلوم ہوا کہ ناصر چچا ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد بمبئی سے لاہور آ گئے ہیں۔ ایک روز میرے جائے قیام پر ان کا فون آیا کہ وہ علی اصغر کو کار لے کر بھیج دیں گے تا کہ وہ مجھے ان کے ہاں ماڈل ٹاؤن لے آئے۔

دوسرے روز صبح کو علی اصغر ایک لمبی چوڑی کار لے کر آ پہنچا۔ اب وہ اٹھارہ سالہ نوجوان تھا۔ جونیئر کیمبرج کے بعد اس نے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا تھا اور اب تفریح میں مصروف تھا۔

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے علی اصغر ــــ" کار میں بیٹھتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔

"اب ہم بزنس کریگا۔ یہ کار ہمارے جس فرینڈ کا ہے ہم اس کی پارٹنر شپ میں کام شروع کرنے والا ہے" اس نے جواب دیا۔ اس کے بعد وہ راستے بھر خاموش رہا۔ اسے شاید اچھی طرح معلوم نہ تھا اور نہ شاید جاننے کی پرواہ تھی کہ میں کون تھی اور میرا اس سے کیا رشتہ تھا۔

"چچا کیسے ہیں ــــ" میں نے کچھ دیر بعد دریافت کیا۔

"ــــ؟" اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"تمہارے والد" میں نے وضاحت کی۔

"اوہ ــــ ڈیڈی ــــ ہی از آل رائٹ، آئی سپوز۔" اس نے جواب دیا اور بڑے اسٹائل سے اور نہایت زناٹے کے ساتھ ڈرائیو کرتے اور آہستہ آہستہ سیٹی بجانے میں مصروف رہا۔

"تمہیں یاد ہے علی اصغر ــــ ایک مرتبہ ہم لوگ تمہارے وہاں بمبئی آئے تھے۔ یاد ہے؟" میں نے ایک بار پھر بات کرنے کی سعی کی۔

"اوہ ــــ؟ یا ــــ یا ــــ یا ــــ آئی ریمیمبر ــــ ناؤ ویٹ یو ٹیل می ــــ تھوڑا سا یاد ہے ــــ" اس نے جواب دیا اور انگریزی دھن کی سیٹی بجانے میں مشغول ہو گیا۔

ماڈل ٹاؤن کی ایک کچی سڑک پر پہنچ کر اس نے جھونک کے ساتھ اسٹیرنگ وہیل گھمائی اور دھچکے کے ساتھ کار ایک پھاٹک کے سامنے روک لی اور مجھے اُتار کر آگے چلا گیا۔

ایک چھوٹی سی کوٹھی کے احاطے میں آم اور پیپتے کے چند درخت کھڑے تھے۔ اور برآمدے کے سامنے گھاس کے ذرا سے قطعے پر ناصر چچا کرسی بچھائے دسمبر کی مدھم

دھوپ میں بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ گھٹنے پہ ایک ہاتھ رکھ کر ذرا دقّت کے ساتھ کرسی سے اُٹھے اور میرے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ میں دوسری کرسی پہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

بمبئی کے اس قیام کے بعد میں ناصر چچا سے اب ملی تھی اور اس طویل وقفے میں دنیا بدل چکی تھی اور کیسی بدلی تھی۔

ناصر چچا چند منٹ تک بالکل خاموش رہے اور پھر آہستہ سے بولے ــــ "سجّاد ہمارا دوست، ہمیں چوٹ دے گیا۔ اس دغابازی کی ہمیں اس سے امید نہیں تھی ــــ" چند لمحوں بعد انہوں نے کہا ــــ "مگر وہ اچھا ہی رہا۔ انقلاب اور شکستہ دلی کا سامنا کرنے سے بچ گیا۔ جنّت میں مزے سے بیٹھا ہوگا اپنے۔"

"جنّت ــــ" میرے حلق میں کوئی چیز آ اٹکی ــــ "مرنے کے بعد روح یا جو کچھ بھی وہ ہے ــــ وہ زندہ رہتی ہے چچا ــــ؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

ناصر چچا نے عینک ماتھے پہ چڑھائی اور بھویں اُٹھا کر مجھے بغور دیکھا، "سوالات کی عادت تمہاری اب تک نہیں گئی۔ کیوں صاحب؟ سوال کرنے چھوڑ دو ــــ سمجھے صاحب ــــ ورنہ زندگی میں تمہیں بہت دکھ ملیں گے ــــ اور خدا نہ کرے کہ تمہیں دکھ ملیں ــــ" پھر وہ کلمے کی انگلی اُٹھا کر ہوا میں کچھ لکھتے رہے اور دفعتاً بولے ــــ "ارے بھائی ہم نے سنا ہے کہ تم افسانہ نگار بن گئی ہو ــــ یہ تو ہمیں یاد ہی نہ رہا تھا" اور ایک دم تیوری پہ بل ڈال کر خفگی سے کہا "تم تو وہ دلفگار رینڈک والا ادب تخلیق نہیں کرتیں ــــ؟"

"دلفگار رینڈک ــــ؟" میں نے تعجّب سے دہرایا۔

"دیکھو ــــ دیکھو یہ کیا واہیات خرافات ہے جو ادب کے نام سے پیش کی جا رہی ہے" انہوں نے میز پر سے ایک رسالہ اٹھایا جو غالباً تازہ ادب لطیف یا ادبی دنیا تھا ــــ اور ایک صفحہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا "میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کیا بکواس ہے ــــ؟ ایں ــــ؟ تم بھی یہی سب لکھتی ہو ــــ؟ سجّاد کی بیٹی ــــ اگر یہ مہمل خرافات لکھ رہی ہے تو ــــ تو ــــ" غم و غصے سے انہوں نے

رسالہ میز پر پٹخ دیا۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ناصر چچا بوڑھے ہو گئے تھے اور ہمیشہ کی طرح بہت پیارے تھے اور اس نئی دنیا اور بمبئی شہر کے اس اداس اجڑے ہوئے "ماڈل ٹاؤن" کی ایک کاٹیج کے ویران احاطے میں بہت بے بس، بے یار و مددگار سے بیٹھے، ترقی پسند ادب پر گھٹنے ہوئے وہ مجھے بے حد پیارے لگے۔

"مگر چچا ــــ" میں نے دبی زبان سے کہا "اول تو میں دل فگار مینڈک نہیں لکھتی۔ دوسرے یہ کہ ابا جان تو اردو کے اوّلین ترقی پسندوں میں سے تھے۔ آپ نئے ادب سے اتنا خفا کیوں ہیں ــ؟"

"مگر سجاد دلفگار مینڈک نہیں لکھتا تھا" انہوں نے گرج کر کہا۔ "ارے گریسی۔" انہوں نے اسی رو میں آواز دی ــــ "ادھر آؤ۔ دیکھو کون آیا ہے"

دوسرے لمحے ایک کھچڑی بالوں والی بوڑھی سی عورت ساری کا پلّو کمر میں کھونسے جھاڑن سے ہاتھ پونچھتی برآمدے میں نمودار ہوئی۔ ذرا ٹھٹھکی اور قریب آکر مجھے ذرا جھک کے اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

"اری احمق الذین ــــ پہچانی نہیں یہ کون ہے؟" چچا نے کہا۔

"اوہ ــــ اوہ ــــ مائی ڈارلنگ ڈارلنگ لٹل سویٹ لٹل گرل ــــ" گریس نے چلا کر کہا اور مجھ سے لپٹ گئی۔

"ابھی یہ سسکیوں سے رونا شروع کر دے گی ــــ" ناصر چچا نے ذرا غصّے سے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ ــــ گریسی ــــ جاؤ ــــ بی بی کے لئے کھانے کا انتظام کرو ــــ خوب مزے دار چیزیں پکاؤ ــــ" انہوں نے ایک بہت پرانی آواز میں اضافہ کیا۔

"کم اِن ــــ کم اِن ــــ ہاؤ آر یو مائی چائلڈ ــــ کم ایلونگ ــــ" گریس نے حسبِ عادت مارے خوشی کے اپنی بے نقط کی انگریزی شروع کی، اور مجھے کاٹیج کے اندر لے گئی۔

یہ ایک بہت بڑی کوٹھی کے احاطے کے اندر بنا ہوا کاٹیج تھا۔ جو غالباً تقسیم سے قبل ہندو مالک مکان کا مہمان خانہ رہا ہوگا اور ناصر چچا نے بھاگ دوڑ کر وا کے اسے اپنے

نام الاٹ کر دالیا تھا۔ انہیں یہاں آئے تقریباً ایک سال ہو گیا تھا مگر گھر کے انداز سے ایسا لگتا تھا۔ جیسے مسافروں کی طرح بیٹھے ہوں۔ میں نے بمبئی کے فلیٹ کی مانوس چیزوں کی تلاش میں نظریں دوڑائیں مگر سعیدہ چچی کی بڑی روغنی تصویر کے علاوہ اور کوئی چیز اس جگہ پر ماضی سے منسلک، نہ تھی۔ چچا پرانی زندگی سے سارے رشتے منقطع کر چکے تھے۔ مجھے دفعتاً ایک بھیانک سا خیال آیا۔ کہ شاید ناصر چچا اب زیادہ دن زندہ نہ رہیں گے۔ دوسرے لمحے مجھے اپنے اس خیال پر بڑا غصہ آیا کہ میں نے ایسی بدشگونی کی بات کیوں سوچی ——

گریس تیز تیز بولتی ہوئی مجھے باورچی خانے میں لے گئی جو اس نے حسب معمول بہت صاف ستھرا رکھا ہوا تھا۔ کھڑکی میں تازہ پھولوں سے بھرا گلدان تک دھرا تھا۔ اس نے فوراً پکانے ریندھنے کا انتظام شروع کر دیا۔ میں ایک مونڈھے پر بیٹھ کر اسے دیکھتی رہی۔

"گریس —— تم تو بوڑھی ہو گئیں ——" میں نے تاسف سے کہا۔

وہ انگیٹھی دہکاتے ہوتے میری طرف مڑی اور آہستہ سے بولی "میرا نام مت لو —— مجھے گریس چچی کہو۔"

"اوہ —— اچھا ——" میں نے جواب دیا۔ انگیٹھی کا دھواں میری آنکھوں میں گھسا تو میں نے آنکھیں میچ لیں اور مجھے دفعتاً بمبئی کی وہ طوفانی رات یاد آگئی جب گریس نے جناب مریمؑ سے جھگڑا کرنے کے بعد صلح کر لی تھی اور مجھے مریکل کے متعلق بتانے سے منکر رہی تھی۔ "مبارک ہو گریس چچی، تم اس عزت کی مستحق نہیں ——" میں نے آنکھیں کھولتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

گریس چچی نے سرعت سے بڑے کاٹنے شروع کیے۔

"گریس چچی! تم نے ملازم نہیں رکھا۔ سارا کام خود کرتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارا انکل کا پنشن ادھر بہت دیری میں ملتا ہے۔ ہم لوگ کا سارا روپیہ ادھر انڈیا میں پھنسا ہے۔ ہم لوگ کا بہت مشکل سے گزر ہوتا ہے اور نوکر کا کیا ضرورت ہے۔ تمہارا انکل کی خدمت کے لئے کیا ہم نہیں ہے؟" بالوں ایک کھچڑی لٹ پیشانی پر سے ہٹا کر انہوں نے کہا۔

"ادھر ہمارا بچہ مدر کیا کہ پاکستان جائے گا بزنس کرے گا۔ بمبئی میں اس نے کچھ اسٹیٹی نہیں کیا، اسکول چھوڑ دیا۔ پھر ادھر اس کو سروس کیسے ملتا؟ پنشن کے بعد صاحب کلکتہ جاکہ رہنا مانگتا تھا۔ مگر ہم لوگ بچے کے خیال سے ادھر آگیا۔ ادھر بھی سب ٹھیک ہے۔ گاڈ از گڈ۔"

مرچیا کی طبیعت کیسی ہے گریس چچی۔ ان کے پاؤں میں کچھ تکلیف ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"تمہارا انکل بہت بیمار رہتا ہے۔ بمبئی میں ہندو مسلمان کی مارا ماری کے زمانے میں موالی لوگ جگہ جگہ آگ لگاتا تھا۔ تمہارا انکل اسے بجھانے کے لئے سارے میں بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ ایک ہندو فیملی کو آگ سے بچاتے میں اپنی ٹانگ توڑ دیا۔ چھ مہینہ بستہ پہ پڑا رہا۔ اس کے بعد سے اس کا ہیلتھ گر گیا۔ گاؤٹ کا تکلیف زیادہ ہوگیا۔ ہائی بلڈ پریشر ہوگیا۔ اب اس کا غصہ بھی بہت تیز ہوگیا ہے۔ ہمارا اتنا شاندار صاحب ایک دم بوڑھا ہوگیا۔ ایک دم اولڈ مین بن گیا،، پھر انہوں نے خالص بیویوں کے انداز میں شکایت کرتے ہوئے کہا "ہم کہتا ہے کہ پرہیزی کھانا کھائے۔ مگر وہ اگڑم بگڑم کھانا مانگتا ہے اور ہم سے لڑتا ہے۔

"جب چھ سات برس اُدھر ہم تمہارے انکل سے شادی بنایا تو اس کو بول دیا تھا۔ کہ اگر تم ہمارے ساتھ کوئی نان سنس کرے گا تو ہم تمہیں چھوڑ کر چلا جائے گا۔" انہوں نے مصنوعی غصّے سے کہا۔

"اب بیماری سے وہ بہت چڑچڑا ہوگیا ہے۔ خالی ہم اس کی بات سمجھ سکتا ہے۔ زالی ہم اس کی خدمت کر سکتا ہے۔ دنیا میں اس کا اب اور کوئی ساتھی نہیں ہے اور ہم خدا سے اب صرف یہی مانگتا ہے کہ اپنے آخری سانس تک اس کی خدمت کرتا رہے۔۔۔" شاید دھوئیں کی وجہ سے گریس چچی کی آنکھ میں پانی آگیا تھا۔ انہوں نے پلّو سے آنکھیں پونچھیں اور نواچڑھا دیا۔

"چچا ڈاکٹر سے علاج باقاعدہ کروا رہے ہیں نا؟ علاج میں تو ضد نہیں کرتے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت ضد کرتا ہے،، گریس چچی نے چپاتی بیلتے ہوئے کہا۔ "ابھی محرّم میں ہم ادھر تو اب

قزلباش کے امام باڑے میں جا کر چاندی کا بڑا ضریح سے کلاوہ باندھا۔ جب صاحب اچھا ہو جائے گا تو اگلے سال امام حسینؑ کو چاندی کا کینڈل چڑھائے گا — انشاء اللہ —"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی "گڈ اولڈ گریس چچی، اب تم یہ سب بھی کرنے لگیں"!

"وائی ناٹ — ؟" انہوں نے چپاتی توے پہ ڈالتے ہوئے کہا "جب ہم ادھر بمبئی میں ساد ی بنایا تو مولوی صاحب نے ہمارا نام کنیز زہرا رکھا اور ہمارے کو کلمہ پڑھایا۔ سناؤں؟"

"ضرور —!"

"اشہد ان لا الہ الا اللہ اشہد ان محمد الرسول اللہ۔ اشہد ان امیرالمومنین امام المتقین علیؑ ولی اللہ وصی رسول اللہ خلیفتہ بلا فصل —"

"بیر — بیر — ونڈر فل۔ گریس چچی کمال کر دیا۔ اتنا لمبا چوڑا کلمہ فر فر یاد ہے!"

اور اسی سانس میں انہوں نے پھکنی اُٹھا کر دوسرے چولہے کی آگ تیز کرنا شروع کر دی۔ اور بڑبڑائیں — "ڈِس ڈیم بلڈی کوئلہ —"

گریس چچی نے اپنے بیٹے کا مزید تذکرہ نہیں کیا۔ بیٹے نے شاید دونوں ماں باپ کو بہت مایوس کیا تھا۔

میں کراچی واپس آگئی تین سال بعد اطلاع ملی کہ ناصر چچا کا انتقال ہو گیا اور علی اصغر بزنس کے لئے ڈھاکے چلا گیا اور مشرقی پاکستان روانہ ہونے سے قبل اس نے گریس چچی سے کہا کہ بزنس کے سلسلے میں اسے جانے کہاں کہاں پھرنا ہوگا اور انہیں پردیس میں بہت زحمت ہوگی اس لئے وہ اپنے وطن واپس چلی جائیں۔ شاید وہ اپنے دوستوں کو بتاتے ہوئے جھینپتا تھا کہ گریس چچی اس کی ماں ہیں۔

اگر علی اصغر گریس چچی کا سگا بیٹا ہوتا اور اسے ان سے دلی، فطرتی محبت ہوتی، تب بھی ممکن تھا کہ وہ اپنی شادی کے بعد ان سے یہی برتاؤ کرتا۔ ماؤں کے ساتھ اکثر یہی کیا جاتا ہے اور گریس چچی ماں نہیں تھیں۔

گریس چچی جانے کہاں گئیں۔ بمبئی واپس آگئیں یا گوا چلی گئیں، یا کہاں غائب ہو گئیں۔ دنیا بہت بڑی ہے اور گریس چچی ایک بہت بے بضاعت گمنام، غیر اہم بوڑھی عورت تھیں۔

بدھ کی شام کو ماہیم کے چرچ آف سینٹ مائیکل میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ گرجا کا ہال، نکونہ صحن اور سامنے کی فٹ پاتھ عبادت گزاروں سے کھچا کھچ بھری ہوتی ہے دور دور تک دکانیں لگتی ہیں۔ جن میں موم کے بچے اور ہاتھ، پاؤں، ناک، کان بکتے ہیں اولاد کی متمنّی عورتیں، غرض مند لوگ، بیمار، روگی، اپاہج اپنی اپنی مراد کے مطابق موم کے بچے اور یہ اعضاء خرید کر مریمؑ کے بڑے مجسّمے کے سامنے چڑھاتے ہیں اور منت مانتے ہیں کہ مراد پوری ہونے پر یہی چیزیں چاندی کی چڑھائیں گے۔ ماہیم کے بس اسٹاپ پر چھوٹے چھوٹے بچے بس کے مسافروں سے مصر رہتے ہیں کہ ان سے موم بتیاں اور پھول خریدے جائیں۔ گرجا کے اندر سنہرا تاج پہنے اور نیلے لبادے میں ملبوس بے حد پیاری شکل والی مریمؑ کا بلند و بالا مجسمہ استادہ ہے اس کے نیچے ایک چھوٹی سی بازنطینی تصویر مقدس ماں اور بیٹے کی ہے۔ ان ساری منتوں مرادوں اور دعاؤں اور وظیفوں کا مرکز یہ چھوٹی سی تصویر ہے جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ معجزہ نما ہے۔ ہر مذہب اور نسل کے لوگ آکر اس تصویر سے اپنا دکھ درد کہتے ہیں۔

ماہیم کا یہ چوراہا بہت مصروف جگہ ہے اس کے ایک طرف بی۔ای۔ایس۔ٹی بسوں کا اسٹیشن ہے۔ اس کے سامنے شیخ اسماعیل عمر اور رحمت اللہ حاجی اسمٰعیل پٹیل کے بانسوں کے ٹال کھڑے ہیں۔ اس سے ملحق ماہم کریک ہے۔ جہاں پانی میں خالی ڈونگیاں تیرتی رہتی ہیں اور ماہی گیروں کی میلی میلی کشتیاں کھڑی رہتی ہیں۔ کریک میں سے گزرنے والی سڑک بمبئی کے جزیرے کو سیلسٹ کے جزیرے سے منسلک کرتی ہے۔ اس سڑک کے دونوں طرف مچھیروں کے سرخ کھپریل کے گھر اور ٹین کی جھگیاں سمندری پتوں میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اس سڑک کے کنارے کنارے محرم کے زمانے میں سبیلیں لگائی جاتی ہیں۔ جن پر چاند تارے والے سبز اسلامی جھنڈے سمندری ہواؤں میں لہراتے رہتے ہیں۔

یہیں کچھ فاصلے پر پانی کے کنارے مخدوم شاہ باباؒ کا مزار ہے۔ جہاں ہر سال دھوم کا عرس ہوتا ہے اور جمعرات کے روز برقعہ پوش عورتوں کے انبوہ جمع ہوتے ہیں۔

باندرہ، جوہو، اور اندھیری جانے والی بسوں اور موٹروں کی لاانتہا ہی قطاریں اس راستے پر گزرتی رہتی ہیں۔ یہیں پر ماہیم ناکہ ہے اور پولیس کے سپاہی مضافات سے آنے والی

ٹیکسیوں اور کاروں کو روک کر اندر جھانکتے ہیں کہ خانہ ساز ناجائز شراب تو سمگل کر کے شہر میں نہیں لائی جا رہی۔

اس سڑک کے دوسرے کنارے پر باندرہ کی خوبصورت اور سبک نقش و نگار والی سنگ سفید کی مسجد ہے جو ماہ رمضان میں برقی قمقموں کے چراغاں سے جگمگاتی رہتی ہے اور دن بھر اس کے شفاف فرش پر بیٹھے ہوئے نمازی اس کی نازک جالیوں کے اندر سے نظر آتے رہتے ہیں۔ اس مسجد کے آگے بڑھ کر تالاب ہے اور "اسلامی ہوٹل" اور "شان محمدی ریسٹورانٹ" اور سبحان اللہ کیفے ــــ"

کربک کی سڑک پر سے بہت دور افق پر گھاٹ کی بھوری پہاڑیاں نظر آتی ہیں جن کے دامن میں ساحلی جھیلیں اور کھاری پانی کے قطعے ہیں۔ اور گاؤں جن میں مان سون کے دنوں میں ندی نالے بہتے پھرتے ہیں۔ اس سڑک کے بائیں جانب سطح آب کے اس پار ناریل کے جھرمٹوں اور گھنے درختوں سے ڈھکا ہوا باندرہ کا جزیرہ نما ہے اور ان درختوں میں سے نکلے ہوئے ماؤنٹ میری کے دو مینارے دور سے نظر آتے ہیں۔ اسی جزیرے نما پر پالی ہل ہے جس کے اوپر مجیر العقول زندگیاں گزارنے والے فلمی ستارے رہتے ہیں۔ جن کے مجیر العقول وجود کی بنا پر ملک کے بیشتر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے ذہنوں نے "عروس البلاد بمبئی" کو جنت الفردوس کا درجہ عطا کر رکھا ہے اور ان فلمی ستاروں اور ان کے نگار خانوں تک رسائی کے لئے یہ نوجوان چست پوش پرستار بقول شخصے اپنا داہنا ہاتھ تک دے سکتے ہیں۔

اور آگے جا کر جوہو کا ساحل ہے جہاں ناریل کے اونچے اونچے نظر فریب جھنڈ ہیں اور جہاں چوڑے پتوں اور بڑے بڑے سرخ پھولوں والے بڑ و پیپل درختوں کے سائے میں بڑے رومینٹک اور افسانوی ناموں والے ہوٹل، تفریح گاہیں اور کاٹیج چھپے ہوئے ہیں۔

باندرہ کے جزیرہ نما پر ماؤنٹ میری ہے ــــ نوزا ایسنورا دو مونتے ــــ پہاڑی کی خاتون مریمؑ۔ ساڑھے تین سو برس قبل پرتگالیوں نے یہاں مریمؑ کا ایک معبد تعمیر کیا تھا اور پچھلی صدیوں میں باندرہ کے پرتگالی قلعہ داروں اور ماہیم کے انگریز قلعہ داروں کے مابین خونریز

لڑائیاں اور گولہ باری ہوا کرتی تھی۔

اس خوب صورت پہاڑی کے تین طرف سمندر ہے اور کیلے اور تاڑ اور کھجور اور رنگ برنگے درختوں میں چھپی، بل کھاتی ہوئی سڑکیں پالی ہل کی طرف جاتی ہیں اور ان درختوں کے پیچھے لکڑی کے جنگلوں اور جھجوں والے "اولڈ ورلڈ" دو منزلہ بنگلے کھڑے ہیں۔ قدیم پرتگالی گرجا کی جگہ پر ایک نیا شاندار چرچ ایستادہ ہے اور اس کے احاطے کی اسٹال پر بھی موم کے بچے اور انسانی اعضاء بکتے ہیں اور ہر سال ۸ ستمبر کو یہاں بڑا بھاری میلہ لگتا ہے۔ گرجا کے مقابل میں ورجن میری کی ایک اونچی شرائن ہے جس پر وہ سمندر کی طرف پشت کئے کھڑی ہیں اور دونوں جانب سے سیڑھیاں مجسمے کی سمت جاتی ہیں — ان سیڑھیوں کے مختلف مقامات ہیں — دعا — عقوبت نفس و کفارہ — مراقبہ — تسبیح و تجدید — اصلاح نفس و بخشش — قربانی — سب سے اونچا مقام — شانتی اور سکون قلب — مقام مریمؑ ہے — زائرین اپنے اپنے عذاب دل میں لئے گھٹنوں کے بل ان سیڑھیوں پر چڑھتے ہیں اور مریمؑ کا دامن پکڑ کر رحم اور مدد کے طالب ہوتے ہیں اور مریمؑ مسکراتی رہتی ہیں اور ان کے پیچھے افق سے افق تک، پھیلا ہوا سرمئی سمندر لہریں مارتا رہتا ہے۔

اسی سمندر میں ساحل کے کنارے سے کئی میل دور جا کر دعاؤں کا ایک اور مرکز ہے جو پانی میں ایک چھوٹے سے ٹاپو پر کھڑا ہے یہ حاجی علیؒ کی درگاہ اور مسجد ہے اور ورلی کی سڑک سے اس درگاہ تک جانے والی پگڈنڈی جوار بھاٹے کے ساتھ ساتھ پانی میں ڈوبتی اور ابھرتی رہتی ہے۔ جمعرات کے روز یہاں قوالیوں کا ہنگامہ رہتا ہے اور حاجی علیؒ کے بس اسٹاپ پر بچے اور عورتیں اگر بتیاں اور چڑھاوے کے پھول بیچتی ہیں اور برقع پوش عورتوں کے ہجوم درگاہ کی طرف جاتے دکھلائی دیتے ہیں اور رات کی سیال تاریکی میں درگاہ ننھے سے لائٹ ہاؤس کی طرح جھلملاتی ہے۔ حاجی علی سے چند فرلانگ کے فاصلے پر مہالکشمی کا مندر ہے۔ جہاں منگل کی شام کو رنگ برنگی ساڑیوں کے پلو آگے ڈالے، بالوں میں موگرے کے ہار سجائے، بڑی بڑی آنکھوں اور متین چہروں والی گجراتی عورتوں کی ٹولیاں آرتی کے لئے

جمع ہوتی ہیں اور جب سرخ رنگ کا مدھم مدھم دہکتا ہوا آفتاب سرعت سے پانی میں ڈوب جاتا ہے اور سمندر کی نیلاہٹ اور شفق کا سیندور ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں تو اس سر کاسنی سناٹے میں مندر کے گھنٹے کی آواز پانی کی لہروں کی طرح نرم روی سے پھیلتی چلی جاتی ہے۔

بدھ کی شام کو ماہیم کے گرجا میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے، کیونکہ یہ نووینا کے وظیفہ کا دن ہے۔

ایک دن میں سامنے سے گزرتی ہوئی گرجا کے اندر چلی گئی۔ ابھی نووینا کا مجمع آنا شروع نہیں ہوا تھا، ہال میں اکا دکا عورتیں بنچوں پر بیٹھی تھیں۔ یا گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی تھیں۔ قربان گاہ پر للی کے سفید پھولوں کے انبار رکھے ہوئے تھے اور سنہری موم بتیاں جل رہی تھیں کتنے ان گنت بدنصیبوں کی آرزوئیں، مایوسیاں، مجبوریاں، پشیمانیاں ان جلتی ہوئی اونچی اونچی موم بتیوں کا دھواں بن کر اس مجسمے کے قدموں میں منڈلاتی رہی ہیں اور میں نے سوچا کہ یہ کیا بات ہے — کہ ہر جگہ — مندروں اور تیرتھ استھانوں میں درگاہوں اور مزاروں کے سامنے، گرجاؤں اور امام باڑوں اور گردواروں اور آتش کدوں کے اندر — یہ عورتیں ہی ہیں جو رو رو کر خدا سے فریاد کرتی ہیں اور دعائیں مانگتی ہیں۔ ساری دنیا کے معبدوں کے سرد بےحس پتھر عورتوں کے آنسوؤں سے دھلتے رہتے ہیں۔ عورتوں نے ہمیشہ اپنے اپنے دیوتاؤں کے چرنوں پر سر رکھا اور کبھی یہ نہ جاننا چاہا کہ اکثر یہ پاؤں مٹی کے بھی ہیں۔

عورتیں اتنی پرستار، اتنی پجارن کیوں ہیں؟ اس لئے کہ وہ کمزور ہیں؟ اور سہارے کی حاجت مند ہیں؟ اس لئے کہ وہ اس مختصر سی زندگی میں بہت سے لوگوں سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں؟ باپ بھائی۔ شوہر۔ اولاد۔ پوتے۔ نواسے، ان سب کے تحفظ اور ان کی سلامتی کے لئے فکرمند رہتی ہیں؟ شوہر یا محبوب کے پیار اور محبت کی ضمانت کسی ان دیکھی طاقت سے چاہتی ہیں؟ اپنے بچوں کے مستقبل کے لئے ہراساں رہتی ہیں؟ آخر عورتیں خدا کی اس قدر ضرورت مند کیوں ہیں؟ عورتیں کمزور ہیں؟ مگر ویلنٹینا بھی تو ہے جو اس وقت خلا کے سفر میں مشغول ہے..... اور عورت کمزور بھی ہے؟

نمن مورتیے کر پن بھر لیلے اسوامی دیو تجھے سگاتی آسا — اگلی بنچ پر بیٹھی ہوئی ایک منگلورین

لڑکی نے اپنا بچہ گود سے اتار کر پاس بٹھایا اور جھک کر دعا شروع کی۔

ذرا عورتوں کی ہمت دیکھئے یہ معاشرے کی تخلیق اور پرداخت کی ذمہ داری سنبھالتی ہیں۔ جب یہ دلہن بنتی ہیں تو انہیں ہزار برس کی نیو کہا جاتا ہے یہ موت کے منہ میں جا کر ایک نئی زندگی دنیا میں لاتی ہیں۔ یہ تکلیفیں اٹھاتی ہیں۔ افلاس اور تنگ دستی کا مقابلہ کرتی ہیں۔ شوہر کی بیوفائی کا سامنا کرتی ہیں۔ سوت کا جلاپا سہتی ہیں۔ نیک امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں۔

"—— استرام تر تو سدیو فال تجے کُسی چے جیزس —— آمین ——"

سوسائٹی میں جگمگانے والی "میم صاحبیں"، لاکھوں روپیہ کمانے والی فلم ایکٹرسیں، بین الاقوامی شہرت کی رقاصائیں، گلیمرس ماڈل لڑکیاں، یونیورسٹیوں کی ریسرچ اسکالر، نہ حکومت کی اعلیٰ افسر، ایئر کنڈیشنڈ بنگلوں میں رہنے والی سوشل ورکر، غلیظ کھولیوں میں رہ کر شرابی شوہروں کی مار کھانے والی مزدورنیں، دفتروں میں چھوٹی چھوٹی نوکریاں کر کے بڑے بڑے کنبے پالنے والی کلرک لڑکیاں شاندار فلیٹوں میں رہنے والی دولت مند تاجروں کی حسین داشتائیں، کولابہ کی سڑکوں پر ٹہلنے والی فیشن ایبل طوائفیں، سفید گلی میں دھندا کرنے والی بکھسائیاں، بیویاں اور باندیاں، رانیاں اور داسیاں بھولی بھالی اور تریاچرتر والی تعلیم یافتہ اور جاہل، معصوم اور دیمپائر ملحد اور اوہام پرست —— ان سب پر اپنی اپنی جگہ کیا گذرتی ہے؟

"ان آئم بابا پارانی پُترا، اسپر بنا —— سنتا بیچے۔ آمین ——"، لڑکی نے بچے کو گود میں لے کر اپنے سے لپٹا لیا اور روتی رہی۔ شاید اس کے شوہر نے کسی دوسری عورت کے پیچھے اسے چھوڑ دیا تھا۔ شاید وہ بیوہ ہوگئی تھی۔ شاید اسے اس کے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ کون جانے وہ کس لئے یوں روتی تھی۔

"سنتا موریے دیوا چے ماتے آمی پاپیا کھاتر ونتی کر —— آمین ——"

وہ اٹھی۔ صلیب کا نشان بنایا۔ قربان گاہ کے آگے ایک گھٹنہ ٹیک کر جھکی اور بچے کو گود میں لئے لئے باہر چلی گئی۔

مجھے گریس پچی یاد آگئیں۔ انہوں نے بھی اسی طرح شاید اسی بنچ پر بیٹھ کر گڑگڑا کر

دعائیں مانگی ہوں گی۔

اور ورجن نے ان کی دعا سن لی ——؟

یا یہ محض ایک اور اتفاق تھا ——؟

فلسفی گریس چچی کے لئے کیا کہیں گے؟ اور تھیلیٹ پرست اور ملحد۔ ہر ایک کے پاس اپنا علیحدہ علیحدہ جواب موجود ہے۔ میں یہ کس سے پوچھنے جاؤں؟ ابا جان مدتیں ہوئیں ختم ہو چکے۔ جن سے میں طرح طرح کے بچگانہ سوالات کیا کرتی تھی اور ناصر چچا یعنی نواب زادہ سید علی ناصر خاں ایم۔ اے ایل ایل بی (علیگ) بھی عرصہ ہوا اپنے دوست سے جا ملے۔ اب میں کس سے جا کر پوچھوں کہ کیا زندگی میں واقعی معجزے ہوتے ہیں؟ اذیت اور افلاس اور بے انصافی اور بے رحمی اور تشدد سے بھری ہوئی اس دنیا میں معجزے ہوتے ہیں ——؟

عبادت گزار اب آ آ کر ہال کی بنچوں پر بیٹھ رہے تھے۔ میں سوچا کی۔ گریس چچی اس وقت جانے کہاں ہوں گی۔ اس بڑھاپے میں کیا اسی بمبئی میں کہیں آیا گیری کر رہی ہوں گی؟ (کیوں کہ ان کے پاس زندگی گزارنے کے لئے ایک مشت بھرے دل کے علاوہ اور کوئی بھی کوالی فیکیشن نہیں تھی) کیا اب بھی وہ اس بنچ پہ آن کر بیٹھتی ہوں گی اور ورجن کو مخاطب کر کے کہتی ہوں گی ——

دیکھو ماں —— ہم تمہارے کو ایک بات بولتا ہے۔ کان کھول کر سن لو —— تم نے ہمارا وش پورا کیا۔ ہمارے بچے کے لئے گھر کا سیکیورٹی بنائے رکھا۔ ہمارا صاحب ورلڈ کا گریٹیسٹ، فائینسٹ مین تھا۔ مگر وہ ہمیں اس دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ اب ہم پھر تمہارے پاس آیا ہے۔ بتاؤ اب ہم کیا کرے۔ ایک دم جلدی بولو —— ورنہ ہمارا تمہارا دوستی ختم ——

اور مجھے ایک لحظے کے لئے ایسا لگا جیسے گریس چچی سچ مچ میرے نزدیک بیٹھی عبادت میں مصروف ہیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا، مگر وہ میرا واہمہ تھا۔

گریس چچی کے بجائے میرے برابر میں موٹے موٹے ہونٹوں والی کوئی گوانی عورت اودے رنگ کی سبز کنارے والی ساڑھی میں ملبوس، بالوں میں سفید پھولوں کا گجرا لپیٹے

کہنیوں تک پھنسی پھنسی آستینوں کا کھن بلاؤز پہنے۔ سیاہ ریشمی جالی سے سر ڈھانپے خاموشی سے تسبیح پھیرنے میں مشغول تھی۔

میں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ مگر جا بجا عقیدت مندوں سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ میں خاموشی سے اٹھی اور باہر آ گئی۔

سڑک پر ٹریفک کا ہجوم تھا۔ لیکن عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ سامنے کریک پر شام کا نیلگوں اندھیرا چھا رہا تھا اور سمندری ہوا میں دور کے زمانوں اور گمشدہ آوازوں کی گونج تھی۔ میں نے دور جزیرہ نما کے افق پر جھکے ہوئے سناٹے کو دیکھا اور مجھے ایک مرہٹی نظم یاد آئی۔

نیلا آسمان ہری
تنہا ستارہ رادھا
کھوئی ہوئی،
وہ دل کی تمنا ہے
سارے زمانوں میں۔
وسیع زمین گووندا
دھان کا کھیت رادھا
ازل سے ابد تک، باوفا
وہ مدھر زبان والی ہے
سارے زمانوں میں
سیدھا بہتا ہوا دریا کرشن
کنارے پہ جھکا جنگل رادھا
جو کوئی سوال نہیں کرتی۔
جسم تسلیم و رضا۔
وہ ابدی راحت ہے۔

سارے زمانوں میں ـــــ

سیاہ سمندر پر روشنیاں ٹمٹمانے لگیں۔ میں پھاٹک پر کھڑے ہوئے عبادت گزاروں کی بھیڑ میں سے نکلتی، فٹ پاتھ پر آگئی اور سڑک عبور کرنے کے لئے سرخ رنگ کے اس مہیب فائر انجن کے گزرنے کا انتظار کرنے لگی جو ٹن ٹن کرتا زنّاٹے سے باندرہ کی طرف نکلا جا رہا تھا۔

قلندر

غازی پور کے گورنمنٹ ہائی اسکول کی فٹ بال ٹیم ایک دوسرے اسکول سے میچ کھیلنے گئی تھی۔ وہاں کھیل سے پہلے لڑکوں میں کسی چھوٹی سی بات پر جھگڑا ہوا اور مار پیٹ شروع ہو گئی اور چونکہ کھیل کے کسی پوائنٹ پر جھگڑا شروع ہوا تھا۔ تماشائیوں اور اسٹاف نے بھی دلچسپی لی۔ جن لڑکوں نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی انہیں بھی چوٹیں آئیں اور ان میں میرے بھائی بھی شامل تھے جو گورنمنٹ ہائی اسکول کی نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ ان کے ماتھے میں چوٹ لگی اور ناک سے خون بہنے لگا۔ اب ہنگامہ سارے میدان میں پھیل گیا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ اور جو لڑکے زخمی ہوئے تھے اس ہڑبونگ میں ان کی خبر کسی نے نہ لی۔

اس پسماندہ ضلع میں ٹیلیفون عنقا تھے۔ سارے شہر میں صرف چھ موٹریں تھیں اور ہاسپٹل ایمبولینس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اتوار کا ویران سا دن تھا۔ ہوائیں زرد پتے اُڑاتے پھر رہے تھے۔ میں لق دق سنسان پچھلے برآمدے میں فرش پر چپ چاپ بیٹھی گڑیاں کھیل رہی تھی۔ اتنے میں ایک یکہ کھڑ کھڑ کرتا آ کے برآمدے کی اونچی سطح سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور سترہ اٹھارہ سال کے ایک اجنبی لڑکے نے بھائی کو سہارا دے کر نیچے اتارا۔ بھائی کے ماتھے سے خون بہتا دیکھ کر میں دہشت کے مارے فوراً ایک ستون کے پیچھے چھپ گئی۔ سارے گھر میں ہنگامہ بپا ہو گیا۔ اماں بدحواس ہو کر باہر نکلیں۔ اجنبی لڑکے نے بڑے رسان سے ان کو مخاطب کیا۔ " ارے ارے دیکھئے گھبرائیے نہیں — گھبرائیے نہیں۔ میں کہتا ہوں —" پھر وہ میری طرف مڑا اور کہنے لگا — "منّی! ذرا دوڑ کر ایک گلاس

پانی تو لے آ بھیا کے لئے"۔ اس پر کئی ملازم پانی کے جگ اور گلاس لے کر بھائی کے چاروں طرف آن کھڑے ہوئے اور لڑکے نے ان سے سوال کیا "صاحب۔ اکدھر ہیں ۔۔۔؟" "صاحب باہر گئے ہوئے ہیں"۔ کسی نے جواب دیا "نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ دفتر میں بیٹھے ہیں" دوسرے نے کہا۔ لڑکا مزید توقف کے بغیر آگے بڑھا اور گیلری میں سے گزرتا ادھر اُدھر دیکھتا ابا جان کے دفتر تک جا پہنچا۔ ابا جان دروازے بند کئے کسی اہم مقدمے کا فیصلہ لکھنے میں مصروف تھے۔ لڑکے نے دستک دی اور اندر داخل ہوگیا اور میز کے سامنے جاکر بڑی خود اعتمادی اور متانت سے بولا ۔۔۔ "صاحب۔ آپ کے صاحبزادے ہمارے اسکول میں میچ کھیلنے آئے تھے۔ ان کو تھوڑی سی چوٹ آ گئی ہے۔ کیونکہ کھیل کھیل میں دنگا ہوگیا تھا۔ میرا نام اقبال بخت ہے۔ میں منشی خوش بخت رائے سکسینہ کا لڑکا ہوں جو سٹی کورٹ میں مختار ہیں۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ ہمارا اسکول بند کرنے کا حکم نہ دیں اور لڑکوں پر جرمانہ بھی نہ کریں۔ کیونکہ ایک تو ہمارے امتحان ہونے والے ہیں اور دوسرے ہمارے لڑکے بہت غریب ہیں ۔۔۔"

ابا جان نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا اور اس کی مدلّل اور پر اعتماد تقریر سن کر بہت متاثر اور محظوظ ہوئے انہوں نے اسے بڑی شفقت سے اپنے پاس بٹھایا۔

اس طرح سے اقبال میاں کا ہمارے یہاں آنا جانا شروع ہوا۔ بھائی سے ان کی کافی دوستی ہوگئی۔ مگر وہ زیادہ تر گھر کی خواتین کے پاس بیٹھتے تھے۔ امور خانہ داری پر صلاح مشورے دیتے تھے۔ بازار کے بھاؤ اور دنیا کے حالات پر روشنی ڈالتے یا لطیفے سناتے۔ جب وہ دوسری مرتبہ ہمارے ہاں آئے تھے تب میں نے بھائی کو آواز دی تھی ۔۔۔ "اقبال میاں آئے ہیں"۔ وہ فوراً نہایت وقار سے چلتے ہوئے میرے نزدیک آئے اور ڈپٹ کر بولے "دیکھو منی۔ میں تم سے بہت بڑا ہوں مجھے اقبال بھائی کہو ۔۔۔ کیا کہو گی؟"

"اقبال بھائی"، میں نے ذرا سہم کر جواب دیا۔

اقبال بھائی مجھے ہمیشہ منی ہی پکارتے رہے۔ مجھے ان کے دیئے ہوئے اس نام سے

سخت چڑ تھی۔مگر ہمت نہ پڑتی تھی کہ ان سے کہوں کہ میرا اصل نام لیا کریں اب وہ سارے گھر کے لئے "افبال میاں"، "اقبال بھائی"، اور "اقبال بھیّا"، بن چکے تھے۔پہلو کے لان پر املتاس کا بڑا درخت ہمارے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا کہ اس کے سائے میں کھاٹ بچھا کر فرصت کے اوقات میں محفل جمتی تھی۔ اس کی صدارت ڈرائیور صاحب کرتے تھے۔ نائب صدر اقبال بھائی خود بخود بن گئے۔ اس محفل کے دوسرے اراکین استاد یوسف خاں۔ جمنا پانڈے مہاراج جیپڑاسی۔ عبدل بیرا اور بھائی تھے۔ بن بلائے مہمان کی حیثیت سے ادھر ادھر لگی رہتی تھی استاد یوسف خاں کے کمرے کا تعلق اندر کے کمروں سے نہیں تھا اور اس کا دروازہ اسی لان پر کھلتا تھا۔ استاد پرانے اسکول کے نہایت نستعلیق اور ثقہ موسیقار تھے۔ رام پور دربار سے ان کا تعلق رہ چکا تھا۔ شاعری بھی کرتے تھے اور دن بھر نولکشور پریس کے چھپے ہوئے کرم خوردہ ناول پڑھا کرتے تھے۔ بوڑھے آدمی تھے آنکھوں میں سرمہ لگاتے تھے اور نوکیلی مونچھیں رکھتے تھے۔ دونوں وقت کا کھانا اور ناشتہ اور چائے بڑے اہتمام سے کشتی میں سجا کر ان کے کمرے میں پہنچادی جاتی تھی۔ سہ پہر کو وہ اندر آکر بڑے تکلف سے اماں کو گت بھیری اور گت بھیم پلاسی سکھلاتے تھے اور اماں بیٹھی ستار پر ٹن ٹن کیا کرتی تھیں۔ اقبال بھائی استاد کے یار غار بن گئے تھے اور آرائش محفل، طلسم ہوشربا، اسرار لندن اور رینالڈز کے ناولوں کا لین دین دونوں کے درمیان چلتا رہتا تھا اقبال بھائی اس سال انٹرنس کا امتحان دینے والے تھے۔

ایک روز مجھے ایک درخت کی شاخ سے لٹکتا دیکھ کر انہوں نے اماں سے کہا "منی پڑھتی لکھتی بالکل نہیں۔ ہر وقت ڈنڈے بجایا کرتی ہے"

"یہاں کوئی اسکول تو ہے نہیں پڑھے کہاں؟" اماں نے جواب دیا۔ "پچھلے دنوں میرے ایک پھوپی زاد بھائی نے مجھے حساب سکھانے کی ہر ممکن کوشش کر دیکھی تھی اور ناکام ہو چکے تھے۔ اقبال بھائی نے فوراً والنیٹر کر دیا۔

"امتحان کے بعد میں اسے پڑھا دیا کروں گا"

اگلے اتوار کو اقبال بھائی نے میرا انٹرویو لیا "انگریزی تو اسے تھوڑی سے آگئی ہے"

اردو فارسی میں بالکل کوری ہے،، انہوں نے اماں کو رپورٹ دی - اور اس کے بعد انہوں نے روزانہ نازل ہونا شروع کر دیا۔ ان کی تنخواہ دس روپے ماہوار مقرر کی گئی ہے روز شام کے چار بجے ان کا یکہ" دور پھاٹک میں داخل ہوتے دیکھ کر میری جان نکل جاتی۔ گرمیاں شروع ہو چکی تھیں۔ اقبال بھائی نے حکم دیا" ہم باغ میں بیٹھ کر تجھے پڑھائیں گے۔ بند دماغ، جس میں بھوسہ بھرا ہوا ہے۔ ٹھنڈی ہوا سے ذرا تازہ ہوگا،، لہذا کھلے باغ میں فالسے کے درخت کے نیچے میری چھوٹی سی بید کی کرسی اور اقبال بھائی کی آرام کرسی میز رکھی جاتی۔ جس روز میں نیکی کی جون میں ہوتی تو مالی سے باغ کی بڑی جھاڑو مانگ لاتی اور فالسے کے نیچے اقبال بھائی کی کرسی کی جگہ پر خوب جھاڑو دیتی اور یوں بھی پڑھائی کے مقابلہ میں مجھے باغ میں جھاڑو دینا کہیں زیادہ اچھا لگتا تھا۔

اقبال بھائی جمع تفریق پر سر کھپانے کے بعد حکم دیتے ــــ" تختی لاؤ،، تختی پر وہ بے حد خوشخطی سے لکھتے ؎

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم
قلم کش را بدولت می رسانم

اپنے ٹیڑھے میڑھے حروف میں میں اس شعر کو کئی مرتبہ لکھتی یہاں تک کہ میری انگلیاں دکھنے لگتیں اور میں دعا مانگتی۔ اللہ کرے اقبال بھائی مر جائیں ــــــــــــ اللہ کرے ــــــ

ایک مرتبہ میں سبق سنانے کے بجائے کرسی پر کھڑی ہو کر ایک ٹانگ سے ناچ رہی تھی۔ کہ اقبال بھائی کو دفعتاً بے تحاشہ غصہ آ گیا۔ انہوں نے میرے کان اس زور سے اینٹھے کہ میرا چہرہ سرخ ہو گیا اور میں چلّا چلّا کر رونے لگی مگر اس کے بعد سے میں نے شرارت کم کر دی۔ اقبال بھائی ابھی مجھے پانچ چھ مہینے ہی پڑھا پائے ہوں گے کہ ابا جان کا تبادلہ غازی پور سے اٹاوے کا ہو گیا۔

اگلے دو تین سال تک اقبال بھائی کے اماں کے پاس کبھی کبھار خط آتے رہے ـــــ "اب ہم نے ایف۔اے کرنے کا ارادہ بھی چھوڑ دیا ہے۔ انٹرنس میں تھرڈ ڈویژن ملا۔ اس

وجہ سے ہمارا دل ٹوٹ گیا ہے۔ بس اب ہم بھی مضطرم، پیشہ کار قانون گویا قرق امین کی حیثیت سے زندگی گزار دیں گے یا حد سے حد والد صاحب قبلہ کی مانند مختار بن جائیں گے اس لئے کبھی سوچتے ہیں قانون کا امتحان دے ڈالیں۔ اور اس کو رد وہ ہیں رہ کر، کر بھی کیا سکتے ہیں —"

پھر ان کے خط آنے بند ہو گئے۔

میں آئی۔ ٹی۔ کالج لکھنؤ کے فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔ اس دن ہمارے یہاں کچھ مہمان چائے پر آئے ہوئے تھے۔ سب لوگ نشست کے کمرے میں بیٹھے تھے کہ برآمدے میں آکر کسی نے آواز دی ——

"ارے بھائی کوئی ہے ——"

"کون ہے —— ؟" اماں نے کمرے میں سے پوچھا۔

"ہم آئے ہیں —— اقبال بخت ——"

اماں نے بے انتہا خوش ہو کر انہیں اندر بلایا۔ کمرے میں بہت جگمگاتے قسم کے لوگوں کا مجمع تھا۔ اقبال بھائی چاروں طرف نظر ڈال کر ذرا جھجکے مگر دوسرے لمحے بڑے وقار کے ساتھ اماں کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔ پھر ان کی نظر مجھ پر پڑی اور انہوں نے بے حد مسرت سے چلا کر کہا: "اری منی —— تو اتنی بڑی ہو گئی!"

میں نئی نئی کالج میں داخل ہوئی تھی اور اپنے "کالج اسٹوڈنٹ" ہونے کا سخت احساس تھا۔ اقبال بھائی نے جب سب لوگوں کے سامنے اس طرح "اری منی ——" کہہ کر مخاطب کیا تو بے حد کوفت ہوئی۔

اقبال بھائی میلا سا پاجامہ اور گھسی ہوئی شیروانی پہنے تھے اور ظاہر تھا کہ ان کی مالی حالت بہت سقیم تھی۔ مگر انہوں نے مختصراً اتنا ہی بتایا کہ کانپور میں ملازم ہو گئے ہیں اور پرائیویٹ طور پر ایف۔ اے۔ سی۔ ٹی کر چکے ہیں پھر وہ ابا جان کے کمرے میں گئے اور ان کے پاس بہت دیر تک بیٹھے رہے۔

اس کے بعد اقبال بھائی پھر غائب ہو گئے۔

دس سال بعد —— مجھے لندن پہنچے چھ سات روز ہی ہوئے تھے۔ میں بی بی سی

کے اردو سیکشن میں بیٹھی ہوئی تھی کہ کسی نے آواز دی ـــــ "ارے بھائی سکینہ صاحب آ گئے کہ نہیں؟"

"آ گئے ـــــ" یہ کہتے ہوئے اقبال بخت سکینہ پردہ اٹھا کر کمرے میں داخل ہوئے گھسی ہوئی برساتی اوڑھے، اخباروں کا پلندہ اور ایک موٹا سا پورٹ فولیو سنبھالے میرے سامنے سے گزرتے ایک میز کی طرف چلے گئے پھر انہوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ پہلے تو انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ ٹکٹکی باندھے چند لمحوں تک دیکھتے رہے "اری منّی ـــــ" ان کے منہ سے نکلا پھر آواز بھرا گئی۔

وہ میرے پاس آ کر بیٹھے اور ابّا جان کی خیریت پوچھی۔ "ابّا جان کا تو کئی سال ہوئے انتقال ہو گیا اقبال بھائی ـــــ" میں نے کہا۔ یہ سن کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اردو سیکشن کے اراکین نے ان کو روتا دیکھ کر خاموشی سے اپنے اپنے کاغذات پر سر جھکا لیا۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ کانپور کی ملازمت اسی سال چھوٹ گئی تھی۔ پھر وہ سارے ملک میں جوتیاں چٹخاتے پھرے۔ اسی دوران میں ان کے والدین کا انتقال ہو گیا۔ وہ اکلوتے بیٹے تھے چھوٹی بہن کی کسی گاؤں میں شادی ہو چکی تھی۔ آزادی کے بعد جب قسمت آزمائی کے لئے انگلستان، کینیڈا اور امریکہ جانے کی ہوا چلی تو وہ بھی ایک دن غازی پور گئے۔ اپنا آبائی مکان فروخت کیا اور اس کے روپے سے جہاز کا ٹکٹ خرید کر لندن آ پہنچے۔ پچھلے چار سال سے وہ لندن میں تھے اور یہاں بھی مختلف قسم کے پاپڑ بیل رہے تھے۔

کسی کو ان کے متعلق ٹھیک سے معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ مجھ سے بھی انہوں نے ایک مرتبہ گول گول الفاظ میں صرف اتنا ہی کہا "ریجنٹ اسٹریٹ پولی ٹیکنیک میں اکنومکس پڑھ رہا ہوں"۔ جس ادارے کا انہوں نے نام لیا میں اس کی اصلیت سے بخوبی واقف ہو چکی تھی۔ جب لوگ اسی مبہم سے لہجے میں یہ کہتے کہ وہ ریجنٹ اسٹریٹ پولی ٹیکنیک میں جرنلزم پڑھ رہے ہیں یا اکنومکس پڑھ رہے ہیں یا فن سنگتراشی یا فوٹوگرافی سیکھ رہے ہیں تو مزید کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو سکتی تھی۔

لیکن بہت جلد مجھے یہ معلوم ہوگیا کہ اقبال بھائی لندن کے ہندوستانی اور پاکستانی طالب علموں کی کمیونٹی کے اہم ستون کی حیثیت رکھتے تھے۔ کوئی ہنگامہ، جلوس، جھگڑا فساد، الیکشن، نتیج تہواران کے بغیر مکمل نہ ہوسکتا تھا تصویروں کی نمائش ہے تو ہال وہ سجا رہے ہیں۔ ناچ گانے کا پروگرام ہے تو مائیکروفون لگا رہے ہیں۔ ڈرامہ ہے تو ریہرسل کے لئے لوگوں کو پکڑتے پھر رہے ہیں۔ دعوت ہے تو ڈائیننگ ہال میں مستعد کھڑے ہیں۔ کبھی کبھی وہ منظر پر سے غائب ہوجاتے اور اطلاع ملتی کہ اتوار کے روز پیٹی کوٹ لین کی منڈی میں لوگوں کو قسمت کا حال بتاتے پائے گئے یا گلاسگو کے کسی بازار میں ہندوستانی جڑی بوٹیاں فروخت کرتے نظر آئے۔ ایک دفعہ معلوم ہوا کہ شہر کے ایک فیشن ایبل محلے کے ایک عالی شان فلیٹ میں فروکش ہیں کبھی وہ بڑھیا ریسٹورانوں میں نظر آتے۔ کبھی مزدوروں کے چائے خانوں میں دکھلائی پڑتے۔ اقبال بھائی شاعری بھی کرتے تھے۔ آسٹریلیا اور ایم سی سی کے تاریخی میچ کے دنوں میں انہوں نے ایک مرثیہ لکھا:۔

ہر تازہ وکٹ پہ ہمہ تن کانپ رہا ہے
بولر ہے بڑا سخت ہٹن کانپ رہا ہے
کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

اقبال بھائی کو فن موسیقی، علم جیوتش، پامسٹری، ہومیوپیتھی، طب یونانی اور آیورویدک سے لے کر پولٹری فارمنگ، کاشتکاری اور باغبانی تک ہر چیز میں دخل تھا اور حلقہ اربابِ ذوق کی محفلوں میں بلاناغہ شرکت کرتے تھے ہم دو تین لوگوں نے مل کر ایک فلم سوسائٹی بنائی۔ جس میں ہم بمبئی سے فلمیں منگوا کر ہندوستانی اور پاکستانی پبلک کو دکھاتے تھے۔ اس دن اقبال بھائی برات کے دولہا بنے ہوتے۔ ٹکٹ بیچ رہے ہیں۔ مہمانوں کو لالا کر بٹھا رہے ہیں۔ فلم شروع ہونے سے پہلے اسٹیج پر جاکر مس مہتاب یا مس نسیم یا مس نمی کو گلدستہ پیش کر رہے ہیں اس زمانے میں انہوں نے یہ بھی طے کر لیا کہ بمبئی جاکر ایک عہد آفریں فلم بنائیں گے۔ جس کی کہانی مکالمے اور گیت خود لکھیں گے ڈائرکٹ بھی خود کریں گے اور ہیرو کے بڑے بھائی یا ہیروئن کے باپ کا رول بھی خود ادا کریں گے اور مجموعی طور پر ساری

فلم انڈسٹری پر رولر پھیر دیں گے"

اقبال بھائی شراب کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے اور منگل کے منگل گوشت نہیں کھاتے تھے۔ ایک روز وہ مجھے ایک سڑک پر نظر آئے اس حالت میں کہ ہاتھ میں بہت قیمتی پھولوں کا ایک گچھا ہے اور لپکے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر بولے "آؤ۔ آؤ۔ میں ذرا ایک دوست کو دیکھنے ہسپتال جا رہا ہوں"۔ میں ساتھ ہو لی۔

ہسپتال میں ایک اسلامی ملک کے سفیر کی بیگم صاحب فراش تھیں۔ اقبال بھائی نے ان کے کمرے میں داخل ہو کر گلدستہ میز پر رکھا اور نہایت خلوص سے مریضہ کی مزاج پرسی میں مصروف ہو گئے۔ اتنے میں سفیر کی بیٹی اندر آئی اور بے حد تپاک سے ان سے ملی۔ میں حیرت سے یہ سب دیکھا کی۔

باہر آ کر کہنے لگے "بھئی یہ لوگ ہمارے دوست ہیں۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ بیچارے"

"صاحبزادی سے آپ کی ملاقات کس طرح ہوئی؟"

"لمبا قصہ ہے پھر کبھی بتائیں گے۔"

وہ لڑکی بے حد بد دماغ تھی۔ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی اور حد سے زیادہ "اینٹی انڈین" مشہور تھی۔ اس وقت بھی اس نے ہسپتال کے کمرے میں کوئی ناگوار سا سیاسی تذکرہ چھیڑ دیا تھا۔

"بھئی اگر ہندوستان کو گالیاں دے کر اس کا دل ٹھنڈا ہوتا ہے" اقبال بھائی نے زینہ اترتے ہوئے مجھ سے کہا "تو اس میں میرا کیا حرج ہے اس کو اسی طرح شانتی ملتی ہے ——"

اس کے کچھ عرصے بعد ہی ایک شام وہ انڈر گراؤنڈ میں مل گئے۔ ساتھ ہی وہ لڑکی اور اس کی ایک کزن بھی تھی۔ لڑکی نے مجھ سے کہا "ہم لوگ ایک مجلس میں جا رہے ہیں۔ آپ بھی چلئے۔"

"میں تو نہ جا سکوں گی۔ میں نے تھیٹر کے ٹکٹ خرید لئے ہیں۔" میں نے معذرت چاہی۔

اقبال بھائی نے بڑے صدمے سے مجھے دیکھا۔ "محرم کی ساتویں تاریخ کو تھیٹر جا رہی ہو؟"

میں بے حد شرمندہ ہوئی۔ "مجھے یاد نہ رہا تھا"، میں نے جواب دیا۔

"آپ شیعہ ہیں یا سُنّی؟" دوسری لڑکی نے سوال کیا۔

"میں قادیانی ہوں"، میں نے جواب دیا۔

"قادیانی؟" وہ خاموش ہو گئی۔ چند منٹ بعد سفیر کی لڑکی نے اظہارِ خیال کیا۔ "اقبال صاحب تو بڑے مومن آدمی ہیں۔ آج کل کے شیعوں میں اپنے مذہب کا اتنا درد کہاں ہے۔"

اتنے میں اسٹیشن آگیا اور وہ تینوں ٹرین سے اُتر گئے۔

اگلے روز بی بی سی میں اقبال بھائی سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا۔ "اقبال بھائی اب آپ یہ فراڈ بھی کرنے لگے! ان لڑکیوں کے سامنے آپ نے خود کو مسلمان ظاہر کیا ہے؟ نہ صرف مسلمان بلکہ شیعہ بھی ——"

جواب ملا —— "دیکھ مُنّی —— دنیا میں اس قدر تفرقہ ہے کہ سب لوگ ایک دوسرے کی جان کو آئے ہوتے ہیں۔ میری جب اس لڑکی سے ملاقات ہوئی تو وہ میرے نام کی وجہ سے مجھے مسلمان سمجھی اور میرے سامنے ہندوؤں کی اور ہندوستان کی خوب خوب برائیاں کیں۔ اس کے بعد اگر میں اسے بتا دیتا کہ میں ہندو ہوں تو اسے کس قدر خجالت ہوتی۔ اور پھر اس میں میرا کیا حرج ہے۔ میرے خاندان میں سینکڑوں برس سے فارسی نام رکھے جاتے ہیں اس سے ہندو دھرم پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ اب اگر میں نے خود کو مسلمان ظاہر کر دیا تو دنیا پر کون سی قیامت آجائے گی؟ بتاؤ؟ ارے واہ ری مُنّی —— اتنی بڑی افلاطون بنتی ہو مگر عقل میں وہی بھوسہ بھرا ہے"

ایک شام میں اپنی ایک دوست زاہدہ کے وہاں گئی۔ وہ بے حد تندہی سے پیکنگ میں جٹی ہوئی تھی اور اپنے سارے خاندان سمیت اگلے روز صبح سویرے رخصت پر کراچی واپس جا رہی تھی۔ زاہدہ کے گھر پہ مجھے یاد آیا کہ اقبال بھائی نے آسٹریلین طلباء کی ایک تقریب میں مدعو کیا ہے۔ "ضرور آنا آسٹریلین بے چارے یہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں ابھی ہی غیر دلچسپ

اور بے رنگ قوم سمجھا جاتا ہے ان کا دل نہیں توڑنا چاہیئے۔"

چند روز قبل میں ایک نیا ہینڈ بیگ خرید کر زاہدہ کے وہاں چھوڑ گئی تھی۔ چلتے وقت خیال آیا کہ اسے لیتی چلوں، بیگ زاہدہ کی سنگھار میز پر رکھا تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں اسباب باندھ رہی تھی۔ میں نے جاتے ہوئے اسے آواز دی کہ میں بیگ لئے جا رہی ہوں۔

"اچھا" اس نے جواب دیا۔ میں نیچے آگئی۔

آسٹریلین طلباء کے وہاں اقبال بھائی ہال کے وسط میں کھڑے آسٹریلیا اور ہندوستان کے دوستانہ تعلقات پر دھواں دھار تقریر کر رہے تھے۔

میں برابر کے کمرے میں گئی جہاں بہت سے لڑکوں، لڑکیوں کا مجمع تھا اور چار پانچ ویٹر چائے بنا بنا کر سب کو دے رہے تھے۔ میں نے نیا ہینڈ بیگ وہیں ایک کھڑکی میں رکھ دیا اور چائے پینے کے بعد ہال میں لوٹ آئی۔ چلتے وقت مجھے ہینڈ بیگ کا خیال آیا۔ میں اسے اندر سے اُٹھا لائی اور اقبال بھائی کے ہاتھ میں دے دیا۔ شاید اس کا کھٹکا کھل گیا تھا۔ زینے سے اترتے ہوئے انہوں نے کھٹکا بند کیا اور بولے "اتنے ڈھیر سارے نوٹ؟"

میں نے بے دھیانی میں ان کی بات پوری طرح نہیں سنی اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگ رہی۔ اسٹیشن پر اقبال بھائی نے بیگ مجھے تھما دیا۔ گھر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ زاہدہ کی کار باہر کھڑی ہے اور دونوں میاں بیوی انتہائی سراسیمگی کی حالت میں لینڈ لیڈی مسز ونگ فیلڈ سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔ زاہدہ مجھے دیکھ کر ہکلانے لگی "وہ ——— وہ بیگ ——— وہ بیگ ———"

"ہاں ——— ہاں۔ میرے پاس ہے تو ——— کیوں؟"

"اس میں میں نے پورے پانچسو پاؤنڈ کے نوٹ ٹھونس دیئے تھے۔ تمہارے جانے کے بعد یاد آیا۔ اور تمہاری بھلکڑ عادت کا خیال کر کے جان نکل گئی کہ اگر تم نے بٹوہ راستے میں کہیں اِدھر اُدھر چھوڑ دیا تو کیا ہوگا۔ یا اللہ تیرا شکر ——— یا اللہ تیرا شکر ——— یا اللہ ———"

دوسرے روز بی بی سی میں میں نے اقبال بھائی کو یہ سنسنی خیز واقع سنایا اطمینان سے بولے "وہ تو میں نے بیگ میں پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ نوٹ ٹھنسے ہوئے ہیں۔"

"آپ نے مجھے اسی وقت کیوں نہ بتایا۔"؟

"میں نے کہا تو تھا تم نے سنا ہی نہیں۔"

"آپ کو یہ خیال بھی نہ آیا کہ میرے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آگیا جسے میں اطمینان سے ادھ کھلے بیگ میں لئے گھوم رہی ہوں۔"

"میں نے سوچا کہیں سے آ ہی گیا ہوگا۔ پوچھنے کی کیا ضرورت تھی"

"اور دو گھنٹے وہ بیگ اسی طرح کھڑکی میں رکھا رہا۔ اگر اس وقت چوری ہو جاتا تو میں زاہدہ کو کیا منہ دکھاتی۔ یا اللہ۔ یا اللہ۔"

"دیکھ مُنّی ——— ہونی کو کوئی انہونی نہیں کر سکتا۔ تیری گویّاں کی قسمت میں تھا کہ اس کا روپیہ اسے صحیح سلامت واپس مل جائے اب تو کیوں فکر کر رہی ہے۔ یہ بتا تو نے اچھما کے لئے بات کی؟"

اچھما کوسوکٹی ایک پریشان حال، دل گرفتہ سی لڑکی تھی۔ جو بہت دنوں سے ملازمت اور ایک سستے سے کمرے کی تلاش میں تھی۔ حال ہی میں مسز ونگ فیلڈ کے نہ خانے میں ایک کمرہ خالی ہوا تھا۔ جس کا کرایہ صرف ڈھائی پونڈ فی ہفتہ تھا۔ مسز ونگ فیلڈ کا اصرار تھا کہ وہ اپنے مکان میں ہر چلتے پھرتے ایرے غیرے کو کرائے دار نہیں رکھتیں اور صرف "بہترین خاندانوں اور اعلیٰ طبقے" کے افراد کو اپنے یہاں رہنے کا شرف بخشتی ہیں۔ ان کے مرحوم شوہر کرنیل سروس میں تھے اور مسز ونگ فیلڈ برسوں کو لمبو میں بڑی میم صاحب کی حیثیت سے زندگی گزار چکی تھیں۔ ان کے سسر نائٹ تھے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میاں کے مرنے اور سلطنتِ برطانیہ کے زوال کے بعد وطن واپس آکر انہیں لینڈ لیڈی بننا پڑا تھا۔ اکثر زینے پر چڑھتے یا اُترتے ہوئے وہ میرا راستہ روک کر اپنی عظمتِ رفتہ کے قصے سنانے لگتیں۔

ایک دن انہوں نے بڑے رازدارانہ لہجے میں بے حد اداسی سے مجھ سے کہا تھا ——

"ایک بات سنو۔ اتنے اچھے اچھے جنٹلمین تمہارے دوست ہیں۔ ان میں سے کسی ایک

سے میری شادی کروادو۔"

رات کو جب میں نے تہ خانے کے کمرے کے متعلق ان سے کہا تو انہوں نے بڑی اچھی موڈ میں تھیں کہ انہوں نے اچھا کہ سوکٹی کے متعلق یہ تک نہیں پوچھا کہ وہ کیا کرتی ہے۔ اور ہر ہفتے کرایہ ادا کرسکے گی یا نہیں۔ چنانچہ دو تین روز میں اچھا کو سوکٹی وہاں منتقل ہو گئی۔

میرا فلیٹ چوتھی منزل پر تھا۔ دوسری منزل پر اور لوگوں کے علاوہ ایک ٹیلیویژن ایکٹرس ایڈوینا کارلائل رہتی تھی۔ جس کے متعلق مسز ونگ فیلڈ مجھ سے کہہ چکی تھیں کہ میں تو اسے کبھی اپنے یہاں جگہ نہ دیتی مائی ڈیئر، مگر وہ بڑی خاندانی لڑکی ہے۔ بس ذرا اس کی زندگی پٹری سے اتر گئی ہے۔

میری اس سے شناسائی صرف اس حد تک تھی کہ زینے پر ٹکر بھیڑ ہو جاتی تو وہ مسکرا کر ہیلو کہہ دیا کرتی تھی۔ مسز ونگ فیلڈ نے اطلاع دی تھی کہ اکثر وہ دن دن بھر کمرے میں اکیلی بیٹھی شراب پیا کرتی ہے۔ وہ اپنے شوہر پر بری طرح عاشق تھی۔ مگر اس نے اس بے چاری کو طلاق دے دی تھی۔ جب ہی سے اس کا یہ حال ہو گیا تھا۔

ایک رات دو بجے کے قریب مدھم سے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے پولس کانسٹیبل کھڑا تھا اور اس کے پیچھے مسز ونگ فیلڈ مارے بدحواسی کے آئیں بائیں شائیں کہہ رہی تھیں ——— "غضب ہو گیا ——— غضب ہو گیا ——— انہوں نے کہا ——— ایڈوینا نے تمہارے غسل خانے کی کھڑکی سے کود کر خودکشی کر لی ———"

"میرے غسل خانے کی کھڑکی سے؟"

"ہاں سب سے اونچی کھڑکی بے چاری ایڈوینا کو یہی دستیاب ہوئی۔"

کانسٹیبل غسل خانے کے اندر گیا۔ کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے نیچے ٹب میں ایڈوینا کا ایک سلیپر پڑا تھا۔ غسل خانے کا دروازہ لینڈنگ پر کھلتا تھا اور مسز ایڈوینا کارلائل بڑے اطمینان سے اس میں داخل ہو کر نیچے کود گئی تھیں۔ میرے ذہن میں صبح کے تہلکہ خیز اخباروں کی سرخیاں کوند گئیں ——— اب رپورٹر میرا انٹرویو کریں گے۔

اس کھڑکی اور ٹب کی تصویریں کھنچیں گی۔ اللہ جانے کیا کیا ہوگا ـــــ نیچے سے آوازوں کی بھنبھناہٹ بلند ہوئی ـــــ "زندہ ہے ـــــ زندہ ہے ـــــ"

میں نے جھانک کر نیچے دیکھا۔ ایڈوینا کو ایمبولینس میں لٹایا جا چکا تھا۔

"زندہ ہے ـــــ؟" مسز ونگ فیلڈ نے ذرا مایوسی سے پوچھا اور کانسٹیبل کے ساتھ تیزی سے نیچے اتر گئیں۔

صبح کو یہ واقعہ میں نے بی بی سی کینٹین میں جملہ خواتین و حضرات کو سنایا۔ اتنے میں اقبال بھائی آ گئے۔ پورا قصہ سن کر بولے "کس ہسپتال میں ہے؟" میں نے بتایا۔ اس کے بعد دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔

اس بات کو چند ہفتے ہی گزرے تھے کہ رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے شور سے پھر میری آنکھ کھل گئی۔ کھڑکی میں سے میں نے جھانک کر دیکھا کہ گراؤنڈ فلور کی سیڑھیوں پر اقبال بھائی دم بخود کھڑے ہیں اور مسز ونگ فیلڈ ان پر بری طرح برس رہی ہیں۔ میں گھبرا کر نیچے اتری۔ مسز ونگ فیلڈ تقریباً ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھیں۔

"مسز ونگ فیلڈ! کیا بات ہے؟" میں نے ذرا درشتی سے پوچھا۔

وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر میری طرف مڑیں۔ "تم خود فیصلہ کر لو۔ جو غنڈہ ہوگا اسے غنڈہ ہی کہا جائے گا۔"

جب انہوں نے اقبال بھائی کو غنڈہ کہا تو مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے منہ پر تھپڑ لگا دیا ہو۔ اقبال بھائی سر جھکائے کھڑے تھے۔

مسز ونگ فیلڈ گرجتی رہیں۔ "تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے یہاں جنٹلمین، لڑکیوں کے کمرے میں رات کو نہیں ٹھہر سکتے ـــــ یہ میرا قانون ہے ـــــ ابھی میرے یہاں ایک خوفناکی کی واردات ہو چکی ہے۔ مجھے اپنے مکان کی نیک نامی کا خیال بھی کرنا ہے۔ میں صرف اعلیٰ خاندان۔"

"مسز ونگ فیلڈ! اصل بات بتائیے کیا ہے؟ آپ مسٹر سکسینہ سے کیا کہہ رہی ہیں؟" میں نے آگ بگولا ہو کر پوچھا۔

"میں ان سے پوچھ رہی ہوں کہ یہ رات کے ساڑھے بارہ بجے مس کوسوکٹی کے کمرے میں کیا کر رہے تھے؟"

اقبال بھائی جیسے مہذب اور وضع دار آدمی کو میری موجودگی میں ایسی لچر باتیں سننا پڑ رہی تھیں۔ ان کا چہرہ غم و غصّے سے سرخ ہو گیا تھا مگر وہ خاموش رہے۔

مسز وانگ فیلڈ غصّے سے بے قابو ہو کر چند منٹ تک اسی طرح چلاتی رہیں۔ گیلری کے دروازے کھلے اور بند ہوئے۔ اوپر کی منزلوں کے دریچوں میں سے سر باہر نکال کر لوگوں نے جھانکا۔ اقبال بھائی چپ کھڑے رہے۔ پھر وہ دفعتاً خاموش ہو گئیں اور اپنے کمرے میں جا کر دروازہ زور سے بند کر لیا۔

نیچے تہ خانے میں اچھّا کو سوکٹی تیز بخار میں نیم بے ہوش پڑی تھی۔ اقبال بھائی رات کے گیارہ بجے والے کر اس کے پاس پہنچے تھے اور گھنٹے بھر سے اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی وقت مسز وانگ فیلڈ نے زینے کے دروازے میں جا کر چلّانا شروع کر دیا تھا۔

"مجھے معلوم نہ تھا کہ اچھّا بیمار ہے"، میں نے نادم ہو کر کہا۔ "میں بھی دس بجے کے بعد واپس آئی ہوں"

"مجھے خود معلوم نہ تھا"، اقبال بھائی نے کہا۔ "دس بجے فون آیا کہ اس کی طبیعت بہت سخت خراب ہے"، پھر انہوں نے آہستہ سے برساتی کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لفافہ نکال کر مجھے دیا۔ "اسے روپے کی ضرورت ہو گی۔ صبح کو اسے دے دینا۔" اتنا کہہ کر وہ سر جھکائے ہوئے سیڑھیاں اُتر کر پھاٹک سے باہر چلے گئے۔ میں نے لفافہ کھولا۔ اس میں دس پاؤنڈ کے نوٹ تھے۔ یہ دس پاؤنڈ اقبال بھائی نے جانے کون کون سے جتن کر کے کمائے ہوں گے۔ میں انہیں سر جھکائے گھسی ہوئی برساتی اوڑھے تیز تیز قدم رکھتے سنسان سڑک پر ایک طرف کو جاتا دیکھتی رہی۔

دوسرے دن میں چند ہفتے کے لئے شہر سے باہر جا رہی تھی۔ واپس آ کر میں ایک اور جگہ منتقل ہو گئی۔ مجھے مسز وانگ فیلڈ سے کوفت ہونے لگی تھی۔ لینڈ لیڈیاں

زیادہ تر عامیانہ ہوتی ہیں۔ مگر مسز وننگ فیلڈ جس انتہائی گھٹیا انداز میں اقبال بھائی پر چیختی تھیں۔ اس منظر کی یاد میرے لئے بہت تکلیف دہ تھی۔

اچھّا کو سوکٹ تندرست ہو چکی تھی۔ اسے کہیں نوکری بھی مل گئی تھی۔ مگر اپنے لئے ساری دوڑ دھوپ کروانے اور اپنے کام نکلوا لینے کے بعد اس نے اقبال بھائی کی طرف سے یکایک سرد مہری اختیار کر لی۔ لیکن وہ وضعداری سے اس سے شناسائی نبھاتے رہے۔

ایک روز فون کی گھنٹی بجی اور ایک خاتون کی آواز آئی ——— "ہیلو ——— ہیلو ——— میں مسز آلوُ ویہارے بول رہی ہوں ———"

"مسز آلوُ ویہارے ———؟" میں نے دہرایا۔

"ہاں! تم مجھے پہچانتی نہیں؟ میں تمہاری پرانی لینڈ لیڈی ہوں۔ سالیٔ مسز وننگ فیلڈ ——— میری شادی ہو گئی ہے۔ آج شام کو میرے ساتھ آکر چائے پیو۔"

شام کو مسز آلوُ ویہارے اپنے کمرۂ نشست کے دروازے پر شاداں و فرحاں مجھ سے ملیں۔

کمرے کے آتش دان پر ایک تصویر رکھی تھی جس میں مسز آلوُ ویہارے اپنی عمر سے کوئی دس سال چھوٹے ایک سنگھالی آدمی کے ساتھ پھولوں کا گچھا ہاتھ میں لئے کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ دولہا کے برابر میں اقبال بخت سکینہ کوٹ کے کالر میں کارنیشن سجائے متبسم تھے۔

"مسٹر سکینہ میرے شوہر کے بیسٹ مین تھے" مسز آلوُ ویہارے نے اطلاع دی۔

"اقبال بھائی ———" دوسرے روز میں نے موصوف سے استفسار کیا۔

"دیکھو منّی بات یہ ہوئی کہ اس رات جو وہ بی بی پنجے جھاڑ کر اس بری طرح میرے پیچھے پڑ گئیں تو میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ حد سے زیادہ فرسٹریشن اور تنہائی کی شکار ہیں۔ ان کی مدد کرنا چاہیئے۔ تو نے بتایا تھا کہ وہ کالے آدمی تک سے شادی کرنے کو تیار ہیں۔ میں کولمبو کے اس آلو ویہارے کو جانتا تھا جو کسی دولت مند بیوہ کی تلاش میں

تھا۔ بڑا شریف اور غریب لڑکا ہے۔ میں نے مسز ونگ فیلڈ کا پتہ اسے بتا دیا۔ دونوں کی زندگی بن گئی۔ اس میں کوئی حرج ہوا میرا؟"

اقبال بھائی سمیت طلباء کا بہت بڑا اچھا سالانہ یوتھ فیسٹیول کے لئے پراگ جا رہا تھا۔ اس سال پاکستانی طلباء کو کمیونسٹ ممالک جانے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ اور ان میں سے چند لوگ اس وجہ سے بہت دل گرفتہ تھے۔ وفد کے پراگ روانہ ہونے سے ایک روز قبل ایک تقریب میں مشرقی پاکستان کے ایک طالب علم نے افسوس سے کہا "ہم لوگ اس سال نہیں جا سکتا۔ ادھر ورلڈ کا سارا کنٹری ہوگا۔ خالی پاکستان نہیں ہوگا۔" اقبال بھائی فوراً اس کے پاس گئے اور رسان سے بولے "نورالفرقان بھائی ——— دل چھوٹا مت کرو۔ پاکستان کی نمائندگی میں کر دوں گا۔"

پراگ میں دنیا بھر سے آئے ہوئے نوجوان ایک عظیم الشان کانسرٹ میں اپنے اپنے ملکوں کے عوامی گیت سنا رہے تھے۔ اتنے میں اسٹیج پر خاموشی چھائی۔ ایک لڑکی نے اناؤنس کیا "اب ہمارے عزیز ملک پاکستان کے نمائندے اپنے دیس کے مزدوروں کا گیت سنائیں گے۔"

پاکستان کے نام پر بہت دیر تالیاں بجتی رہیں۔ اور سفید کھڑکھڑاتی ہوئی شلوار، سیاہ شیروانی اور بھورے رنگ کی قراقلی سے مزین بے حد رعب داب اور وقار سے چلتے ہوئے کامریڈ اقبال بخت مائیکروفون کے سامنے آئے۔ پاکستان میں عوامی اور ترقی پسند تحریک کی ناکامی کے اسباب پر روشنی ڈالی اور کہا ——— "ساتھیو! اب میں آپ کو اپنے وطن عزیز کے محنت کش طبقے کا ایک محبوب اور روح پرور گیت سناتا ہوں" اور بے حد پاٹ دار آواز میں انہوں نے شروع کیا ———

بوجھ اُٹھالو ہیّا ہیا ——— بوجھ اُٹھایا۔ ہیّا ہیّا!
محل بنے گا راجہ جی کا ——— پیٹ پلے گا ہمارا تمہارا
اونچا کر لو ہیّا ہیّا ——— بوجھ اُٹھالو ——— شیر بہادر۔ ہیّا ہیّا

مجمع پر اس گیت کا بے انتہا اثر ہوا۔ اور حسبِ معمول سامعین نے ساتھ ساتھ

آواز ملانی شروع کر دی۔ مگر آگے چل کر۔۔۔ پید مطلبی فرید آبادی کے اس مشہور گیت کے باقی بول اقبال بھائی کے ذہن سے بالکل اتر گئے۔ دراصل ان کو یاد ہی صرف تین بول تھے لیکن انہوں نے بڑے اطمینان سے گانا جاری رکھا۔

پیالی اٹھاؤ کیسے بھائی ——— ایسے بھائی ہیّا ہیّا

چمچا اُٹھاؤ۔ چمچہ اٹھایا ——— ہاں ہاں بھائی ہیّا ہیّا

ہزاروں کے مجمع نے ایک ساتھ دہرادیا ———

چمچا اٹھاؤ۔ چمچہ اٹھایا ——— ہاں ہاں بھائی ہیّا ہیّا

اس طرح جو جو الفاظ اقبال بھائی کے دماغ میں آتے گئے وہ ہیّا ہیّا کے ساتھ جوڑتے گئے اور تالیوں کے طوفان میں ان کا گیت انتہائی کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔

چیکوسلواکیہ سے واپسی کے کچھ دن بعد اقبال بھائی نے اطلاع دی "میں نے سانپوں کا کاروبار شروع کر دیا ہے۔"

"سانپوں کا کاروبار ———؟" میں نے دہرایا۔ مگر مجھے مطلق تعجب نہ ہوا۔ کیوں کہ اقبال بھائی کچھ بھی کر سکتے تھے۔

"کئی سو بندر بھی ہیں ———" انہوں نے ذرا انکسار سے اضافہ کیا۔ "دراصل" انہوں نے کھنکار کر کہنا شروع کیا ———

"بات یہ ہے مُنّی کہ یہ اپنے خالد صاحب جو ہیں نا۔ ان کے سُسر مسٹر چراغ دین امریکہ کے چڑیا گھروں اور تجربہ گاہوں کو سانپ اور بندر سپلائی کرتے ہیں۔ مجھے انہوں نے اپنی فرم میں نوکر رکھ لیا ہے اور اب میں وہاں کا کام سنبھالنے امریکہ جا رہا ہوں۔"

چنانچہ اقبال بھائی سانپوں کا کاروبار کرنے امریکہ چلے گئے۔

ایک روز ڈاک کے ذریعہ مجھے ایڈوینا کارلائل کا مختصر سا خط ملا۔ جو آئرلینڈ سے آیا تھا۔ ایڈوینا نے لکھا تھا:۔

"ساری دنیا نے مجھے چھوڑ دیا تھا مجھے اپنے وجود سے نفرت ہو چکی تھی۔ میں نے موت کا سہارا ڈھونڈا مگر مرنے میں بھی اپنی زندگی

ہی کی طرح ناکام رہی۔ سال بھر تک میں پلاسٹر آف پیرس میں جکڑی ہسپتال میں پڑی رہی اور مسٹر سکسینہ ہر ہفتہ ہر موسم میں، ہر حالت میں گھنٹہ بھر کے لئے میرے پاس آکر بیٹھتے تھے اور سمجھاتے تھے کہ زندہ رہنے کے لئے ہمت نہ ہارنا کس قدر ضروری ہے۔"

"مجھے معلوم نہیں آج کل وہ کہاں ہیں۔ یہ خط میں آپ کو اس لئے لکھ رہی ہوں کہ ان کو میرا اسلام پہنچا دیجئے ——"

مگر مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ مسٹر سکسینہ آج کل کہاں ہیں انہوں نے امریکہ پہنچ کر کسی کو ایک کارڈ تک نہ بھیجا تھا۔

میں وطن واپس آگئی۔ اقبال بھائی کے متعلق کسی کو معلوم نہ ہوا کہ وہ کونسی وادی اور کون سی منزل میں ہیں۔ لیکن کوئی چار سال ہوتے میری ایک چچا زاد بہن تعلیم ختم کر کے سان فرانسسکو سے لوٹی تو اس نے اطلاع دی۔

"میں نے اقبال بھائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔"

"کہاں ——؟"

"ہالی وڈ میں۔ خاص الخاص بیورلی ہلز پہ ——"

"بیورلی ہلز پہ کیا کرتے ہیں ——؟"

"رہتے ہیں۔ ایک بہت عالی شان محل میں۔ جس میں دو سوئمنگ پول ہیں کیڈلیک کاروں کی ایک فلیٹ ہے۔ وغیرہ وغیرہ مجھے انہوں نے کھانے پر بھی بلایا اپنے ہاں۔ نیگرو بٹلر —— اور —— اور ——"

راوی نے مزید بتایا کہ ساتھیوں کے کاروبار کے لئے امریکہ پہنچنے کے تیسرے دن ہی مسٹر چراغ دین اور مسٹر اقبال بخت سکسینہ کے درمیان کچھ اختلاف رائے ہو گیا جس کے نتیجے کے طور پر مسٹر سکسینہ کو اپنی ملازمت سے مستعفی ہونا پڑا۔ اس کے بعد سنہری مواقع کے اس دیس میں موصوف انواع و اقسام کی ملازمتیں اور مزدوریاں کرتے کیلیفورنیا پہنچے۔ وہاں سکھ اور پنجابی مسلمان زمینداروں کے کھیتوں پر کام کرتے رہے۔

وہاں سے ہالی وڈ تشریف لے گئے اور مشرق کے متعلق بنائی جانے والی تصویروں میں چینی رکشا والے ہندوستانی فقیر، قلی اور سپیرے اور عرب بدّو کے ایک ایک دو دو منٹ والے رول بخیر و خوبی ادا کرتے رہے اور ایک ریسٹوران میں ویٹر بن گئے۔ ایک مشہور فلم پروڈیوسر کی کہ وڑپتی بیوہ اس جگہ کبھی کبھی کھانا کھانے آیا کرتی تھی۔ وہ لاولد بے حد بوڑھی عورت تھی جسے آنکھوں سے بھی کم سجھائی دیتا تھا اور وہ بیورلی ہلز پر اپنے شاندار محل کے اندر شدید تنہائی میں زندہ تھی۔ ہالی وڈ حسن اور جوانی کا پرستار ہے۔ ایک پچھتر سالہ بوڑھی اور اندھی عورت سے دو منٹ بات کرنے کا بھی وہاں کسی کے پاس وقت نہ تھا۔ جب وہ ریسٹوران میں آکر کونے میں اپنی مخصوص میز پر بیٹھ جاتی تو اقبال بھائی بڑی عجلت سے اس کی مزاج پرسی کرتے۔ ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کون ہے۔ بوڑھی ان کی بے حد ممنون ہوگئی اور اس نے ان کو اپنے گھر مدعو کیا۔ پھر وہ اکثر اس کے ہاں جاتے اور اسے اخبار اور رسالے پڑھ کر سناتے۔ اس بوڑھی کی کمپینئن اپنی دوسرا تھ کے معاوضے میں بھاری تنخواہ لیتی تھیں۔ اقبال بھائی محض جذبۂ انسانیت کی بنا پر اس کے پاس بیٹھے رہتے۔ آخر اس نے اصرار کیا کہ وہ اس کے وہاں منتقل ہو جائیں۔ چنانچہ اقبال بھائی اب بیورلی ہلز کے اس محل میں رہتے ہیں اور بڑھیا شاید قانونی طور پر ان کو اپنا بیٹا بنانے والی ہے۔

"اقبال بخت سکسینہ کی داستان" ——— یہ ساری کتھا سن کر کسی نے کہا ——— "کامیابی کی کلاسیک داستان ہے۔"

لیکن چھ مہینے کے بعد ایک اور صاحب امریکہ سے واپس آئے انہوں نے اقبال بھائی کو اسی ریسٹوران میں ویٹر کے یونیفارم میں دیکھا۔ تب یہ معلوم ہوا کہ اس کہ وڑپتی بڑھیا کا انتقال ہوگیا۔ وہ کافی خیطی اور سنکی ضعیفہ تھی اور اپنی ساری دولت اس نے پیرس کے کسی سبزی فروش کے نام چھوڑی ہے۔ اقبال بھائی اپنے کام پر واپس آ چکے ہیں۔

آج تیسرے پہر کو میں شاردا مہتہ کے گھر کے سامنے سے گزر رہی تھی کہ اس نے

مجھے آواز دی۔ وہ اسی وقت کار میں سوار ہو رہی تھی۔ "کہاں جا رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔ میں نے بتایا "میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں۔ آؤ تم کو راستے میں اتار دوں گی۔ ست سنگ کا سمے تین بجے کا تھا۔ مجھے دیر ہو گئی۔"

شاردا مہتہ ایک سیدھی سادھی نارمل، مذہبی قسم کی ہاؤس وائف ہے اور جب سے اس کی اکلوتی لڑکی پولیو میں مبتلا ہوئی ہے پوجا پاٹ، مندروں، یاتراؤں، سادھو سنتوں، پیروں فقیروں، درگاہوں اور منتوں مرادوں کا سلسلہ اس کے یہاں بہت زیادہ ہو گیا ہے یوں بھی وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کی خوش عقیدگی، بھروسے، یقین اور رجائیت کی بنا پر دنیا قائم ہے۔

مضافات میں پہنچ کر ایک جگہ ایک گجراتی سیٹھ کی شاندار حویلی میں شاردا کی کار داخل ہوئی۔ ست سنگ ختم ہو چکا تھا اور موٹریں واپس جا رہی تھیں۔

"ارے۔ تمہارا ست سنگ تو ختم ہو گیا" میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں گورو جی کے درشن تو کر لوں گی۔ وہ کل سویرے امرناتھ جا رہے ہیں مجھے پانچ منٹ لگیں گے۔ تم بھی اتر آؤ" اس نے جواب دیا۔

سامنے برآمدے میں ایک غیر ملکی خاتون سفید ساڑھی میں ملبوس چندن کا بڑا سا ٹیکہ پیشانی پر لگائے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھی چند خواتین کو گیتا کا سبق دے رہی تھیں۔ ان کی عمر چالیس پینتالیس برس کی رہی ہوگی اور لب و لہجے سے امریکن معلوم ہوتی تھیں۔ شاردا نے نزدیک جا کر انہیں پرنام کیا "یہ ماتا جی ہیں" اس نے چپکے سے مجھ سے کہا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

دہلیز پر چپل اتار کر اور آنچل سے سر ڈھانپ کر میں بھی اندر گئی۔ کمرے میں سفید چاندنی بچھی تھی۔ جس پر جا بجا گیندے کے پھول اور گلاب کی پنکھڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ عقیدت مند ابھی ابھی اٹھ کر گئے تھے۔ اس لئے چاندنی پر سلوٹیں پڑی تھیں۔ ایک طرف ہارمونیم، کھڑتالیں اور تان پورے رکھے تھے۔ دریچوں میں تازہ گلدستے سجے تھے اور لوبان جل رہا تھا۔ وسط میں صندل کی چوکی پر سفید براق کپڑے پہنے کھچڑی بالوں کی لٹیں کندھے پر چھٹکائے گورو جی

پدم آسن میں بیٹھے تھے۔ گیتا کا درس انہوں نے ابھی ختم کیا تھا۔ کتاب چوکی پر رکھی تھی۔ اور وہ خاموشی سے دریچے کے باہر دیکھ رہے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر قطعاً تعجب نہ ہوا کہ وہ اقبال بخت سکسینہ تھے۔

انہوں نے شاید ایک بار پھر مجھے نہیں پہچانا یا اگر پہچانا تو ظاہر نہیں کیا۔ چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھے وہ مجھے دیکھتے رہے۔ پھر اسی طرح انہوں نے خلا پر نظریں جما دیں۔

شاردا نے جھک کر انتہائی عقیدت سے ان کے پاؤں چھوئے اور پیچھے ہٹی اور اس نے آنکھوں سے مجھے اشارہ کیا کہ میں اس کے ساتھ باہر چلوں کیونکہ وہ درشن کر چکی تھی۔ لیکن شاردا کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ میں آہستہ سے آگے بڑھی اور میں نے جھک کر گرو جی کے پاؤں چھوئے۔

بچپن میں اقبال بھائی نے میرے کان اینٹھے تھے۔ مجھے ڈانٹ ڈانٹ کر انتہائی سخت گیری اور محنت سے پڑھنا لکھنا سکھایا تھا اور استاد کا رتبہ ماں باپ کے برابر ہوتا ہے۔ وہ دنیا کے لئے جانے کس چکر میں اور کس طریقے سے "گرو جی" بن گئے تھے۔ لیکن ان کو گرو جی سمجھنے کا حق صرف مجھے پہنچتا تھا۔

انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر خاموشی سے مجھے اشیرباد دی اور اسی طرح سامنے کی طرف دیکھتے رہے۔ میں نے دبے پاؤں دہلیز تک پہنچ کر چپل پہنی اور شاردا کے ساتھ باہر آ گئی۔

اب مردوں اور عورتوں کی ایک قطار "درشن" کے لئے اندر جا رہی تھی۔

اور برآمدے سے اُترتے ہوئے میں نے سوچا کہ اگر میں ان سے سوال کرتی ــــ "اقبال بھائی۔ آپ نے اب کی بار اتنا لمبا چوڑا فراڈ کیوں کیا؟" تو وہ جواب دیتے "دیکھ مُنّی ــــ دنیا شانتی کی تلاش میں دیوانی ہو گئی ہے۔"

اب اگر میں اس بھیس میں چند دکھی آتماؤں کو تھوڑی سی شانتی دے سکتا ہوں تو اس میں میرا کیا خرچ ہے ؟"

اور کیا معلوم اقبال بھائی خود بھی مکتی کے راستے پر پہنچ گئے ہوں ۔ اپنے دل کا بھید وہ خود جانیں۔ دوسرے جاننے والے کون؟

کارمن

رات کے گیارہ بجے ٹیکسی شہر کی خاموش سڑکوں پر سے گزرتی ایک پرانی وضع کے پھاٹک کے سامنے جا کر رکی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھول کر بڑی قطعیت کے ساتھ میرا سوٹ کیس اتار کر فٹ پاتھ پر رکھ دیا اور پیسوں کے لئے ہاتھ پھیلائے تو مجھے ذرا عجیب سا لگا۔

"یہی جگہ ہے؟" میں نے شبے سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ میں نیچے اتری۔ ٹیکسی گلی کے اندھیرے میں غائب ہو گئی اور میں سنسان فٹ پاتھ پر کھڑی رہ گئی۔ میں نے پھاٹک کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر سے بند تھا۔ تب میں نے بڑے دروازے میں جو کھڑکی لگی تھی اسے کھٹکھٹایا کچھ دیر بعد کھڑکی کھلی۔ میں نے چوروں کی طرح اندر جھانکا۔ اندر مدھم تاریک آنگن تھا۔ جس کے ایک کونے میں دو لڑکیاں رات کے کپڑوں میں ملبوس آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ آنگن کے سرے پر ایک چھوٹی سی شکستہ عمارت ایستادہ تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لئے گھسیاری منڈی لکھنؤ کا اسکول یاد آ گیا جہاں سے میں نے بنارس یونیورسٹی کا میٹرک پاس کیا تھا۔ میں نے پلٹ کر گلی کی طرف دیکھا جہاں مکمل خاموشی طاری تھی۔ فرض کیجئے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ کہ یہ جگہ افیمچیوں، بردہ فروشوں اور سمگلروں کا اڈہ نکلی تو؟ میں ایک اجنبی ملک کے اجنبی شہر میں رات کے گیارہ بجے ایک گمنام عمارت کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی جو گھسیاری منڈی کے اسکول سے ملتا جلتا تھا!

ایک لڑکی کھڑکی کی طرف آئی۔

"گڈ ایوننگ! یہ وائی ڈبلیو سی اے ہے نا؟" میں نے ذرا عجز سے مسکرا کر پوچھا۔
"میں نے تار دلوا دیا تھا کہ میرے لئے ایک کمرہ ریزرو کر دیا جائے، مگر کس قدر خستہ حال وائی ڈبلیو سی اے ہے یہ ——— میں نے دل میں سوچا۔
"ہمیں آپ کا کوئی تار نہیں ملا۔ اور افسوس ہے کہ سارے کمرے گھر سے ہوئے ہیں۔"
اب دوسری لڑکی آگے بڑھی ——— "یہ ورکنگ گرلز کا ہوسٹل ہے۔ یہاں عام طور سے مسافروں کو نہیں ٹھہرایا جاتا۔" اس نے کہا۔
میں یک لخت بے حد گھبرا گئی۔ اب کیا ہوگا؟ میں اس وقت یہاں سے کہاں جاؤں گی؟ دوسری لڑکی میری پریشانی دیکھ کر خوش خلقی سے مسکرائی۔
"کوئی بات نہیں۔ گھبراؤ مت۔ اندر آ جاؤ ——— ادھر سے کود آؤ ———"
"مگر کمرہ تو کوئی خالی نہیں ہے ———" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میرے لئے جگہ کہاں ہوگی؟"
"ہاں ہاں۔ کوئی بات نہیں۔ ہم جگہ بنا دیں گے۔ اب اس وقت آدھی رات کو تم کہاں جا سکتی ہو؟" اسی لڑکی نے جواب دیا۔ میں سوٹ کیس اٹھا کر کھڑکی سے اندر آنگن میں کود گئی۔ لڑکی نے سوٹ کیس مجھ سے لے لیا۔ عمارت کی طرف جاتے ہوئے میں نے جلدی جلدی کہا۔ "بس آج کی رات مجھے ٹھہر جانے دو۔ میں کل صبح اپنے دوستوں کو فون کر دوں گی۔ میں یہاں تین چار لوگوں کو جانتی ہوں۔ تم کو بالکل زحمت نہ ہوگی۔"
"فکر مت کرو ———" اس نے کہا۔ پہلی لڑکی شب بخیر کہہ کر غائب ہو گئی۔
ہم سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں پہنچے۔ برآمدے کے ایک کونے میں لکڑی کی دیواریں لگا کر ایک کمرہ سا بنا دیا گیا تھا۔ لڑکی سرخ پھولوں والا دبیز پردہ اٹھا کر اس میں داخل ہوئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے گئی "یہاں میں رہتی ہوں۔ تم بھی یہیں سو جاؤ۔"
اس نے سوٹ کیس ایک کرسی پر رکھ دیا اور الماری میں سے صاف تولیہ اور نیا صابن نکالنے لگی۔ ایک کونے میں چھوٹے سے پلنگ پر مچھر دانی لگی تھی۔ برابر میں سنگھار میز رکھی تھی اور کتابوں کی الماری ——— جیسے کمرے ساری دنیا میں لڑکیوں کے ہوسٹلوں میں ہوتے

ہیں ـــــ لڑکی نے فوراً دوسری الماری میں سے چادر اور کمبل نکال کر فرش کے گھسے ہوئے بدرنگ قالین پر بستر بچھایا اور پلنگ پر نئی چادر لگا کر مچھر دانی کے پردے گرا دیئے۔

"لو تمہارا بستر تیار ہے"

مجھے بے حد ندامت ہوئی۔ "سنو میں فرش پر سو جاؤں گی"

"ہرگز نہیں۔ اتنے مچھر کاٹیں گے کہ حالت تباہ ہو جائے گی۔ ہم لوگ ان مچھروں کے عادی ہیں۔ کپڑے بدل لو ـــ" اتنا کہہ کر وہ اطمینان سے فرش پر بیٹھ گئی۔ میرا نام کارمن ہے۔ میں ایک دفتر میں ملازم ہوں اور شام کو یونیورسٹی میں ریسرچ کرتی ہوں کیمسٹری میرا مضمون ہے۔ میں وائی ڈبلیو کی سوشل سیکریٹری بھی ہوں۔ اب تم اپنے متعلق بتاؤ" میں نے بتایا۔

"اب سو جاؤ" مجھے اونگھتے دیکھ کر اس نے کہا۔ پھر اس نے دوزانو جھک کر دعا مانگی اور فرش پر لیٹ کر فوراً سو گئی۔

صبح کو عمارت جاگی۔ لڑکیاں سروں پر تولیہ لپیٹے اور ہاؤس کوٹ پہنے غسل خانوں سے نکل رہی تھیں۔ برآمدے میں سے گرم قہوے کی خوشبو آ رہی تھی۔ دو تین لڑکیاں آنگن میں ٹہل ٹہل کر دانتوں پر برش کر رہی تھیں۔

"چلو تمہیں غسل خانہ دکھا دوں" کارمن نے مجھ سے کہا اور ہال میں سے گزر کر ایک گلیارے میں لے گئی جس کے سرے پر ایک ٹوٹی پھوٹی کوٹھری سی تھی۔ جس میں صرف ایک نل لگا تھا اور دیوار پر ایک کھونٹی گڑی تھی۔ اس کا فرش اکھڑا ہوا تھا اور دیواروں پر سیلن تھی۔ روشندان کے ادھر سے کسی لڑکی کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ اس غسل خانے کے اندر کھڑے ہو کر میں نے سوچا۔ کیسی عجیب بات ہے ـــ مدتوں سے یہ غسل خانہ اس ملک میں، اس شہر میں، اس عمارت میں اپنی جگہ پر موجود ہے ـــ اور میرے وجود سے بالکل بے خبر ـــ اور آج میں اس میں موجود ہوں۔ کیسا بے وقوفی کا خیال تھا۔

جب میں نہا کے باہر نکلی تو نیم تاریک ہال میں ایک چھوٹی سی میز پر میرے لئے ناشتہ چنا جا چکا تھا۔ کئی لڑکیاں جمع ہو گئی تھیں کارمن نے ان سب سے میرا تعارف کرایا۔ بہت جلد ہم سب پرانے دوستوں کی طرح قہقہے لگا رہے تھے۔

"اب میں ذرا اپنے جاننے والوں کو فون کر دوں" چار ختم کرنے کے بعد میں نے کہا۔

کارمن شرارت سے مسکرائی "ہاں اب تم اپنے بڑے بڑے مشہور اور اہم دوستوں کو فون کرو اور ان کے وہاں چلی جاؤ۔ تمہاری پرواکون کرتا ہے کیوں روزا؟ ــــ ہم اس کی پرواکرتے ہیں؟"

"بالکل نہیں۔" کورس ہوا۔

لڑکیاں میز پر سے اٹھیں "ہم لوگ اپنے اپنے کام پر جا رہے ہیں۔ شام کو تم سے ملاقات ہو گی۔" میگدلینا نے کہا۔

"شام کو ــــ؟" ایمیلیا نے کہا "شام کو یہ کسی کنٹری کلب میں بیٹھی ہو گی ــــ"

کارمن کے دفتر جانے کے بعد میں نے برآمدے میں جا کر فون کرنے شروع کئے ــــ فوج کے میڈیکل چیف میجر جنرل کیمو گلڈاس۔ جو جنگ کے زمانے میں میرے ماموں جان کے رفیقِ کار رہ چکے تھے ــــ مسز انطونیا کوسٹیلو ــــ ایک کروڑپتی کاروباری کی بیوی جو یہاں کی مشہور سماجی لیڈر تھیں اور جن سے میں کسی بین الاقوامی کانفرنس میں ملی تھی۔ الفانسو دیرا ــــ اس ملک کا نامور ناول نگار اور جرنلسٹ جو ایک دفعہ کراچی آیا تھا ــــ "ہیلو ــــ ہیلو ــــ ارے ــــ تم کب آئیں، ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی ــــ؟ کہاں ٹھہری ہو ــــ؟ وہاں ــــ؟ گڈ گاڈ! وہ کوئی ٹھہرنے کی جگہ ہے ــــ؟ ہم فوراً تمہیں لینے آ رہے ہیں۔" ان سب نے باری باری مجھ سے یہی الفاظ دہرائے۔ سب سے آخر میں میں نے ڈون گارسیا ڈیل پر بڈوس کو فون کیا۔ یہ مغربی یوروپ کے ایک ملک میں اپنے دیس کے سفیر رہ چکے تھے اور وہیں ان سے اور ان کی بیوی سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی ان کے سیکرٹری نے بتایا کہ وہ لوگ آج کل پہاڑ پر گئے ہوئے ہیں۔ اس نے میری کال اُن کے پہاڑی محل میں منتقل کر دی۔

تھوڑی دیر بعد مسز کوسٹیلو اپنی مرسی ڈینز میں مجھے لینے کے لئے آگئیں کارمن کے کمرے میں آکر انہوں نے چاروں طرف دیکھا اور میرا سوٹ کیس اُٹھالیا۔

مجھے دھکا سا لگا۔ میں ان لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میں کارمن، ایمیلیا، برنارڈ اور وزا اور مگدیلینا کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔

"سامان ابھی رہنے دیجئے۔ شام کو دیکھا جائے گا"، میں نے ذرا جھینپ کر مسز کوسٹیلو سے کہا۔

"مگر تم کو اس نامعقول جگہ پر بے حد تکلیف ہوگی"، وہ برابر دہراتی رہیں۔

رات کو جب میں واپس آئی تو کارمن اور ایمیلیا پھاٹک کی کھڑکی میں ٹھنسی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ "آج ہم نے تمہارے لئے کمرے کا انتظام کر دیا"، کارمن نے کہا میں خوش ہوئی کہ اب اسے فرش پر نہ سونا پڑے گا۔

ہال کی دوسری طرف ایک اور بیلے ہوتے کمرے میں دو پلنگ بچھے تھے۔ ایک پر میرے لئے بستر لگا تھا دوسرے پر مسز سوریل بیٹھی سگریٹ پی رہی تھیں۔ وہ اڑتیس انتالیس سال کی رہی ہوں گی ان کی آنکھوں میں عجیب طرح کی اُداسی تھی۔ پولینیزین نسل کی کسی شاخ سے ان کا تعلق تھا، ان کی شکل سے معلوم نہ ہو سکتا تھا۔ پلنگ پر نیم دراز ہو کر انہوں نے فوراً اپنی زندگی کی کہانی سنانا شروع کر دی "میں گام سے آئی ہوں"۔ انہوں نے کہا۔ "گام کہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"بحرالکاہل میں ایک جزیرہ ہے۔ اس پر امریکن حکومت ہے۔ وہ اتنا چھوٹا جزیرہ ہے کہ دُنیا کے نقشے پر اس کے نام کے نیچے صرف ایک نقطہ لگا ہوا ہے۔ میں امریکن شہری ہوں"، انہوں نے ذرا فخر سے اضافہ کیا۔

گام ـــــ میں نے دل میں دہرایا۔ کمال ہے۔ دنیا میں کتنی جگہیں ہیں اور ان میں بالکل ہمارے جیسے لوگ بستے ہیں۔

"میری لڑکی ایک وائلن بجانے والے کے ساتھ بھاگ آئی ہے میں اسے پکڑنے آئی ہوں وہ صرف سترہ سال کی ہے۔ مگر حد سے زیادہ خودسر ـــــ یہ آج کل کی

لڑکیاں ۔۔؟ پھر وہ دفعتاً اُٹھ کر بیٹھ گئیں ۔۔ ”مجھے کینسر ہوگیا تھا“

”اوہ ۔۔۔“ میرے مُنہ سے نکلا۔

”مجھے سینے کا کینسر ہوگیا تھا۔“ انہوں نے بڑے الم سے کہا ”ورنہ تین سال قبل ۔۔۔ میں بھی ۔۔۔ میں بھی اور سب کی طرح نارمل تھی ۔۔۔“ ان کی آواز میں بے پایاں کرب تھا ۔۔ ”دیکھو ۔۔۔“ انہوں نے اپنے نائٹ گون کا کالر سامنے سے ہٹا دیا۔ میں نے لرز کر آنکھیں بند کرلیں۔ ایک عورت سے اس کے جسم کی خوب صورتی ہمیشہ کے لئے چھن جائے۔ کتنی قہرناک بات تھی۔

تھوڑی دیر بعد مسز سوربل سگریٹ بجھا کر سوگئیں۔ کھڑکی کی سلاخوں میں سے چاند اندر جھانک رہا تھا۔ نزدیک کے کمرے سے گریلینا کے گانے کی دھیمی آواز آنی بھی بند ہوگئی۔

دفعتاً میرا جی چاہا کہ پھوٹ کر روؤں۔

اگلا ہفتہ فیشن ایبل رسالوں کی زبان میں ”سوشل اور تہذیبی مصروفیات کی آندھی“ کی طرح ”آرٹ و کلچر“ کے معاملات میں گزرا۔ دن مسز کوسٹیلو اور ان کے احباب کے حسین، پرفضا مکانوں میں اور شامیں شہر کی جگمگاتی تفریح گاہوں میں بسر ہوتیں ہر طرح کے لوگ ۔۔۔ انٹلکچوئیل ۔۔۔ جرنلسٹ ۔۔۔ مصنف ۔۔۔ سیاسی لیڈر ، مسز کوسٹیلو کے گھر آتے اور ان سے بحث مباحثے رہتے اور میں انگریزی محاورے کے الفاظ میں اپنے آپ کو گویا بے حد ”اینجوائے“ کر رہی تھی۔ میں رات کو وائی ڈبلیو واپس آتی اور ہال کی چوکور میز کے ارد گرد بیٹھ کر پانچوں لڑکیاں بڑے اشتیاق سے مجھ سے دن بھر کے واقعات سنتیں ”کمال ہے ۔۔۔“ روزا کہتی ۔۔۔ ”ہم اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ مگر ہمیں معلوم نہیں کہ یہاں ایسی الف لیلوی فضائیں بھی ہیں۔

”یہ بے حد امیر لوگ، جو ہوتے ہیں نا۔ یہ اتنے روپے کا کیا کرتے ہیں؟“ ایمیلیا پوچھتی۔ ایمیلیا ایک اسکول میں پڑھاتی تھی۔ روزا ایک سرکاری دفتر میں اسٹینوگرافر تھی۔ گریلینا اور برنارڈا ایک میوزک کالج میں پیانو اور وائلن کی اعلےٰ تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔

یہ سب متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی لڑکیاں تھیں۔

اتوار کی صبح کارمن ماس میں جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ کوئی چیز نکالنے کے لئے میں نے الماری کی دراز کھولی تو اس کے جھٹکے سے اوپر سے ایک اُونی جرگوش نیچے گر پڑا۔ میں اسے واپس رکھنے کے لئے اُوپر اُٹھی تو الماری کی چھت پر بہت سارے کھلونے رکھے نظر آئے۔

"یہ میرے بچّے کے کھلونے ہیں"، کارمن نے سنگھار میز کے سامنے بال بناتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔

"تمہارے بچّے کے ——؟" میں ہکّا بکّا رہ گئی اور میں نے بڑے دکھ سے اسے دیکھا۔ کارمن بن بیاہی ماں تھی۔

آئینے میں میرا ردِ عمل دیکھ کر وہ میری طرف پلٹی۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور اس نے کہا —— "تم غلط سمجھیں"! پھر وہ کھِل کھلا کر ہنسی اور اس نے الماری کی نچلی دراز میں سے ایک ہلکے نیلے رنگ کی چمکیلی و بے بی بُک، نکالی "دیکھو —— یہ میرے بچّے کی سالگرہ کی کتاب ہے۔ جب وہ ایک سال کا ہوگا تو یہ کرے گا۔ جب دو سال کا ہو جائے گا تو یہ کرے گا۔ یہاں اس کی تصویریں چپکاؤں گی ——"، وہ اطمینان سے آلتی پالتی مار کر پلنگ پہ بیٹھ گئی اور اسی کتاب میں سے خوب صورت امریکن بچّوں کی رنگین تصویروں کے تراشے نکال کر بستر پر پھیلا دیئے "دیکھو میری ناک کتنی چپٹی ہے اور نک تو مجھ سے بھی گیا گزرا ہے۔ تو ہم دونوں کے بچّے کی ناک کا سوچو تو کیا حشر ہوگا؟ میں اس کی پیدائش سے مہینوں پہلے یہ تصویریں دیکھا کروں گی تاکہ اس بے چارے کی ناک پر کچھ اثر پڑے۔"

"تم دیوانی ہو اچھی خاصی!!"، میں نے کہا "اور یہ نک کون بزرگ ہیں؟"

اس کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا۔ "ابھی اس کا ذکر نہ کرو۔ اس کے نام پر مجھے لگتا ہے کہ میرا دل کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔"

مگر اس کے بعد وہ برابر نک کا ذکر کرتی رہی "میں اتنی بدصورت ہوں۔ مگر نک کہتا ہے۔ کارمن —— کارمن —— مجھے تمہارے دل سے، تمہارے دماغ سے، تمہاری

روح سے عشق ہے، نِک نے اتنی دُنیا دیکھی ہے۔ اتنی حسین لڑکیوں سے اس کی دوستی رہی ہے۔ مگر اسے میری بدصورتی کا ذرا بھی احساس نہیں۔"

گرجا سے واپسی پر، خلیج کے کنارے کنارے سڑک پر چلتے ہوئے، وائی ڈبلیو کے نمناک ہال میں کپڑوں پر استری کرتے ہوئے کارمن نے مجھے اپنی اور نِک کی داستان سنائی۔ نِک ڈاکٹر تھا اور ہارٹ سرجری کی اعلیٰ ٹریننگ کے لئے باہر گیا ہوا تھا اور اسے دیوانہ وار چاہتا تھا۔

رات کو میں مسز سورّیل کے کمرے سے کارمن کے کمرے میں واپس آ چکی تھی، کیونکہ مسز سورّیل اپنی لڑکی کو پکڑ لانے میں کامیاب ہو گئی تھیں اور لڑکی اب ان کے ساتھ مقیم تھی۔ سونے سے پہلے میں مچھر دانی ٹھیک کر رہی تھی۔ کارمن پھر فرش پہ آسن جمائے بیٹھی تھی۔

"نِک ——" اس نے کہنا شروع کیا۔

"آج کل کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں"

"تم اسے خط نہیں لکھتیں؟"

"نہیں"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"تم خدا پہ یقین رکھتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"یہ تو بہت لمبا چوڑا مسئلہ ہے" میں نے جمائی لے کر جواب دیا "مگر یہ بتاؤ کہ تم اسے خط کیوں نہیں لکھتیں؟"

"پہلے میرے سوال کا جواب دو۔ تم خدا پر یقین رکھتی ہو؟"

"ہاں" میں نے بحث کو مختصر کرنے کے لئے کہا۔

"اچھا۔ تو تم خدا کو خط لکھتی ہو؟"

عمارت کی روشنیاں بجھ گئیں۔ رات کی ہوا میں آنگن کے درخت سرسرا رہے تھے۔ کمرے کے دروازے پر پڑا ہوا سُرخ پھولوں والا پردہ ہوا کے جھونکوں سے پھڑپھڑائے جا رہا تھا۔ میں نے اُٹھ کر اسے ایک طرف سرکا دیا۔

"بہت خوبصورت پردہ ہے۔" میں نے پلنگ کی طرف لوٹتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔ کارمن فرش پر کروٹ بدل کر آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ میری بات پر وہ پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا ——"میں اور نِک ایک مرتبہ پہاڑی علاقے میں کئی سو میل کی ڈرائیو کے لئے گئے تھے —— سن رہی ہو ——؟"

"ہاں —— ہاں —— بتاؤ ——"

"راستے میں نِک نے کہا کہ چلو ڈون ریموں سے ملتے چلیں۔ ڈون ریموں نِک کے والد کے دوست اور کابینہ کے وزیر تھے اور انہوں نے حال ہی میں اپنے ضلع کے پہاڑی مقام پر نئی کوٹھی بنوائی تھی۔ جب ہم لوگ ان کی کوٹھی کے نزدیک پہنچے تو سامنے سے سفید فراک پہنے بہت سی چھوٹی چھوٹی بچیاں ایک اسکول سے نکل کر آتی دکھائی دیں۔ مجھے وہ منظر ایک خواب کی طرح یاد ہے۔ پھر ہم لوگ اندر گئے اور مسز ریموں کے انتظار میں ان کے شاندار ڈرائنگ روم میں بیٹھے۔ کیبنٹ منسٹر گھر پر موجود نہیں تھے۔ ڈرائنگ روم اور اسٹڈی روم کے درمیان جو دیوار تھی۔ اس میں شیشے کی ایک چوکور ڈبیہ ایسی کھڑکی میں پلاسٹک کی ایک بہت بڑی گڑیا سجی تھی جو کمرے کی نفیس آرائش کے مقابلے میں بہت بھدی معلوم ہو رہی تھی۔ ہم دونوں اس بدمذاقی پر چپکے سے مسکرائے۔ پھر مسز ریموں برآمد ہوئیں۔ انہوں نے ہمیں ٹھنڈی چائے پلائی اور سارا گھر دکھلایا۔ ان کے غسل خانے سیاہ ٹائل کے تھے اور مہمان کمرے کے نفیس "دیوان بیڈ" سُرخ پھول دار ٹیپسٹری (TAPESTRY) کے جھالر والے غلافوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ان پلنگوں کو دیکھ کر نِک نے چپکے سے مجھ سے کہا تھا "بدمذاقی کی انتہا" اور میں نے اپنے دل میں کہا تھا —— کوئی بدمذاقی نہیں۔ میں تو اپنے گھر کے لئے ایسے ہی پلنگ خریدوں گی اور اسی رنگ کے غلاف بنواؤں گی اس کے بعد —— میں جب

بھی گھریلو ساز و سامان کی دوکانوں سے گزرتی تو اس کپڑے کو دیکھ کر میرے قدم ٹھٹھک جاتے۔ پھر میں نے تنخواہ میں سے بچا بچا کر اسی قیمتی کپڑے کا یہ پردہ خرید لیا۔

"جب میں ایک مخصوص چینی ریستوران کے آگے سے گزرتی ہوں ——" وہ اسی آواز میں کہتی رہی "اور شیشے کے دریچے کے قریب رکھی ہوئی میز اور اس پر جلتا ہوا سبز لیمپ نظر آتا ہے تو میرا دل ڈوب سا جاتا ہے۔ وہاں میں نے ایک شام نک کے ساتھ کھانا کھایا تھا"

مجھے نیند آ رہی تھی اور میں نک کے اس وظیفے سے اکتا چکی تھی۔ میں نے مچھر دانی کے پردے گراتے ہوئے کہا۔ ایک بات بتاؤ —— تم کو اس قدر شدید عشق ہے اپنے اس نک سے تو تم نے اس سے شادی کیوں نہ کر لی اب تک کیوں جھک مارتی رہیں ——؟"

"مجھے دس سال تک ایک دور افتادہ جزیرے میں اپنے بابا کے ساتھ رہنا پڑا" اس نے اداسی سے جواب دیا "پہلے ہم لوگ اسی شہر میں رہتے تھے۔ جنگ کے زمانے میں بمباری سے ہمارا چھوٹا سا مکان جل کر راکھ ہو گیا اور میری ماں اور دونوں بھائی مارے گئے۔ صرف میں اور میرے بابا زندہ بچے۔ بابا ایک اسکول میں سائنس ٹیچر تھے۔ ان کو ٹی بی ہو گئی اور میں نے انہیں سینے ٹوریم میں داخل کر دیا جو بہت دور کے جزیرے میں تھا۔ سینے ٹوریم بہت مہنگا تھا۔ اس لئے کالج چھوڑتے ہی میں نے اسی صحت گاہ کے دفتر میں نوکری کر لی اور آس پاس کے دولت مند زمینداروں کے گھروں میں ٹیوشن بھی کرتی رہی مگر بابا کا علاج اور زیادہ مہنگا ہوتا گیا۔ تب میں نے اپنے گاؤں جا کر اناس کا آبائی باغیچہ رہن رکھ دیا۔ تب بھی بابا اچھے نہ ہوئے۔ میں ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے کشتی میں بیٹھ کر جاتی اور زمینداروں کے محلوں میں ان کے کند ذہن بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے تھک کر چور ہو جاتی۔ تب بھی بابا اچھے نہ ہوئے۔ نک سے میری ملاقات آج سے دس سال قبل ایک فیسٹا (FIESTA) میں ہوئی تھی۔ اس دوران میں جب بھی میں دارالسلطنت آتی وہ مجھ سے ملتا رہتا۔ تین سال ہوئے اس نے شادی پر اصرار کیا۔ لیکن بابا کی حالت اتنی خراب تھی کہ میں ان کو مرتا چھوڑ کر یہاں نہ آ سکتی تھی۔ اسی زمانے میں نک کو باہر جانا پڑ گیا۔ جب بابا مر گئے تو میں یہاں آ گئی اب میں یہاں ملازمت کر رہی ہوں اور اگلے سال یونیورسٹی میں اپنا مقالہ بھی داخل کر دوں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ بابا کے کھیت

بھی رہن سے چھڑا لوں۔ نک میری مدد کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں شادی سے پہلے اس سے ایک پیسہ نہ لوں گی۔ اس کے خاندان والے بڑے بد دماغ اور اکڑ فوں والے لوگ ہیں اور ایک لڑکی کے لئے اس کی عزتِ نفس بہت بڑی چیز ہے۔ عزت نفس اور خودداری اور خود اعتمادی، اگر مجھے کبھی یہ احساس ہو جائے کہ نک بھی مجھے حقیر سمجھتا ہے ــــ یا مجھے ــــ؟ سو گیس ــــ؟ اچھا گڈ نائٹ ــــ"

دوسرے روز صبح وہ تیار ہو کر حسب معمول سب سے پہلے ناشتے کی میز پر انتظام کے لئے پہنچ چکی تھی مسز سوریل گام واپس جا رہی تھیں۔ اپنے ہونے والے داماد سے ان کی صلح ہو گئی تھی۔ وہ سویرے ہی سے آن پہنچا تھا۔ وہ ایک مخنی سا نوجوان تھا اور برآمدے کے ایک کونے میں بھیگی بلی بنا بیٹھا تھا۔ فضا پر عجیب سی بشاشت طاری تھی۔ لڑکیاں بات بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔ میں بھی بہت مسرور تھی اور خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ یہ ہلکے پھلکے پن اور مکمل امن و سکون کا شگفتہ احساس زندگی میں بہت کم آتا ہے اور صرف چند لمحے رہتا ہے۔ مگر وہ لمحے بہت غنیمت ہیں۔

کارمن جلدی جلدی ناشتہ ختم کر کے دفتر چلی گئی۔

"آج بھی تم اپنے شاندار دوستوں سے ملنے نہ جا رہی ہوتیں تو تم کو جیپنی (JEEPNEY) میں بٹھا کر شہر کے گلی کوچوں کی سیر کراتے ــــ" لگدیلینا نے مجھ سے کہا۔

"تمہارے لئے ایک کیڈی لیک آئی ہے بھئی" روزا نے اندر آ کر اطلاع دی۔

"کیڈی لیک ــــ! افوہ ــــ!!" کورس ہوا۔

"تمہارے لئے ایسی ایسی جغادری موٹریں آتی ہیں کہ ہم لوگوں کی رعب کے مارے بالکل گھگھی بندھ جاتی ہے۔!" برنارڈ نے خوشدلی سے اضافہ کیا۔ میں نے لڑکیوں کو خدا حافظ کہا اور اپنا سفری بیگ کندھے سے لٹکا کر باہر آ گئی۔ میں سابق سفیر ڈون گارسیا ڈیل پر بیڈوس کے وہاں دو دن کے لئے ان کے ہل اسٹیشن جا رہی تھی۔ ان کے وردی پوش شوفر نے سیاہ کیڈی لیک کا دروازہ مودبانہ بند کیا اور کار شہر سے نکل کر سرسبز پہاڑوں کی سمت روانہ ہو گئی۔

پہاڑ کی ایک چوٹی پر ڈون گارسیا کا ہسپانوی وضع کا شاندار گھر درختوں میں چھپا دور سے نظر آرہا تھا۔ وادیوں میں کہرہ منڈلا رہا تھا اور سفید اور کاسنی اور سرخ اور زرد رنگ کے پہاڑی پھول سارے میں کھلے ہوئے تھے۔ کار پھاٹک میں داخل ہوکر پورچ میں رک گئی۔ قبائلی نسلوں والی شائستہ نوکرانیاں باہر نکلیں۔ بٹلر نے نیچے آکر کار کا دروازہ کھولا۔ ہال کے دروازے میں ڈون گارسیا اور ان کی بیوی ڈونا ماریا میرے منتظر تھے۔ ان کا گھر سفید قالینوں اور سنہرے فرنیچر اور انتہائی قیمتی سامان آرائش سے سجا ہوا تھا اور اس طرح کے کمرے تھے۔ جن کی تصویریں لائف میگزین کے رنگین صفحات پر ویپرپڈ، یا انٹیریر ڈیکوریشن، کے سلسلے میں اکثر شائع کی جاتی ہیں۔

کچھ دیر بعد میں ڈونا ماریا کے ساتھ اوپر کی منزل پر گئی۔ وہاں شیشوں والے برآمدے کے ایک کونے میں ایک نازک سی بید کی ٹوکری میں ایک چھ مہینے کی بے حد گلابی بچی پڑی غاؤں غاؤں کر رہی تھی۔ وہ بچی اس قدر پیاری سی تھی کہ میں ڈونا ماریا کی بات ادھوری چھوڑ کر سیدھی ٹوکری کے پاس چلی گئی۔ ایک بے حد حسین، صحت مند، تروتازہ اور میکسن امریکن لڑکی نزدیک کے صوفے سے اٹھ کر میری جانب آئی اور مسکرا کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"یہ میری بہو ہے" ڈونا ماریا نے کہا۔

ہم تینوں ٹوکری کے گرد کھڑے ہوکر بچی سے لاڈ پیار میں مصروف ہوگئے۔

دوپہر کو لنچ کی میز پر امریکن لڑکی کا شوہر بھی آگیا۔

"یہ ہمارا بیٹا ہوزے ہے۔" ڈون گارسیا نے کہا۔

ہوزے کی عمر تقریباً پینتیس سال کی رہی ہوگی۔ اپنی قومی کرتھست کی ہلکے آبی رنگ کی قمیص اور سفید پتلون میں وہ خاصہ وجیہہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اپنی نوعمر بیوی کو بے انتہا چاہتا تھا اور بچی پر عاشق تھا۔ زیادہ تر وہ اسی کی باتیں کرتا رہا۔

رات کو میں اپنی بے حد پرتکلف اور بڑھیا خواب گاہ میں گئی جس کے ساز و سامان کو ہاتھ لگاتے فکر ہوتی تھی کہ کہیں میلا نہ ہو جائے۔ اس وقت مجھے "وائی ڈبلیو" کے سیلے ہوئے کمرے اور تنگ مجھ ۔انی اور مسز سوربل اور ہال کی بدرنگ میز کرسیاں شدت سے یاد آئیں۔

دو دن بعد پڑوس خاندان میرے ساتھ ہی دارالسلطنت واپس لوٹا۔

اپنے ماں باپ کو ان کے ٹاؤن ہاؤس میں اُتارنے کے بعد ہوزے نے مجھے میری جائے قیام پہ پہنچانے کے لئے کیڈی لیک دوبارہ اسٹارٹ کی۔ ہوزے اور اس کی بیوی ڈورتھی صرف دو ہفتے قبل امریکہ سے لوٹے تھے۔ ان کا بہت سا سامان کسٹم ہاؤس میں پڑا تھا جسے چھڑانے کے لئے انہیں جانا تھا۔

شہر کے سب سے اعلیٰ ہوٹل کے سامنے ہوزے نے کار روک لی۔

"یہاں کیا کرنا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"تم یہیں ٹھہری ہو نا؟"

"نہیں! ڈیئر ہوزے۔ میں وائی ڈبلیو سی اے میں ٹھہری ہوں۔"

"وائی ڈبلیو ——؟" گڈ گاڈ! کمال ہے۔ اچھا وہیں چلتے ہیں۔ مگر کیا تم کو یہاں جگہ نہ مل سکی؟ تمہیں چاہیئے تھا کہ آتے ہی ڈیڈی کو اطلاع دیتیں۔"

اس وقت مجھے دفعتاً خیال آیا کہ میں ہر طبقے اور ہر قسم کے لوگوں کو اپنی افتادِ طبع کے ذریعے کم از کم اپنی حد تک ذہنی طور پر ہموار کرتی چلی جاتی ہوں۔ مگر ہوزے اور اس کے والدین اس ملک کے دس دولت مند ترین خاندانوں میں شامل تھے اور یہاں کے حکمران طبقے کے اہم ستون تھے اور ان لوگوں کو یہ سمجھانا بالکل بے کار تھا کہ مجھے وائی ڈبلیو کیوں اتنا اچھا لگا ہے اور میں وہاں ٹھہرنے پر کیوں اس قدر مصر ہوں۔

ہوزے نے گلی کے نکڑ پہ کار روک لی۔ کیونکہ "جیپنیوں" کی ایک قطار نے سارا راستہ گھیر رکھا تھا میں جب وائی ڈبلیو کے اندر پہنچی تو سب لوگ سو چکے تھے۔ میں چپکے سے جا کر اپنی مچھر دانی میں گھس گئی۔ کارمن حسبِ معمول فرش پہ سکون کے ساتھ سو رہی تھی۔ اس کے سرہانے سانتو طوماس (سینٹ طامس) کی تصویر پہ گلی کے لیمپ کا مدھم عکس جھلملا رہا تھا۔

صبح چار بجے اٹھ کر میں دبے پاؤں جلتی شکستہ غسل خانے میں گئی اور آہستہ سے پانی کا نل کھولا۔ مگر پانی کی دھار اس زور سے نکلی کہ میں چونک اُٹھی۔ اسی طرح چپکے چپکے کمرے میں آ کر میں نے اسباب باندھا کہ آہٹ سے کارمن کی آنکھ نہ کھل جائے۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ وہ فرش

پر سے غائب ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے آ کر کہا "ناشتہ تیار ہے۔" وہ ٹیکسی کے لئے فون بھی کر چکی تھی۔

"کیسا سفر رہا؟" اس نے چائے انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"بہت دلچسپ۔"

"یہ تمہارے دوست لوگ کون تھے جہاں تم گئی تھیں؟ تم نے بتایا ہی نہیں۔"

میں بات شروع کرنے ہی والی تھی کہ مجھے اچانک ایک خیال آیا۔ میں نے جلدی سے کمرے میں جا کر سوٹ کیس کھولا۔ ایک نئی بنارسی ساڑھی نکال کر ایک پرچے پر لکھا ——— "تمہاری شادی کے لئے میرا پیشگی تحفہ ———" اور ساڑھی اور پرچہ کارمن کے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

"ٹیکسی آ گئی۔" کارمن نے برآمدے میں سے آواز دی۔

ہم دونوں سامان اٹھا کر باہر آئے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ اتنے میں کارمن پھاٹک کی کھڑکی میں سے سر نکال کر چلائی ——— "ارے تم نے اپنا پتہ تو دیا ہی نہیں۔" میں نے کاغذ کے ٹکڑے پر اپنا پتہ گھسیٹ کر اسے تھما دیا۔ پھر مجھے بھی ایک بے حد ضروری بات یاد آئی۔ "حد ہو گئی کارمن۔ تمہاری وائی ڈبلیو نے مجھے اپنا بل نہیں دیا۔"

"بکو مت۔"

"ارے۔ یہ تمہارا نجی گھر تو نہیں تھا۔"

"تم میری مہمان تھیں۔"

"بکو مت۔"

"تم خود مت بکو۔ اب بھاگو ورنہ ہوائی جہاز چھوٹ جائے گا اور دیکھو۔ جب میں شادی کا کارڈ بھیجوں تو تم کو آنا پڑے گا میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ ذرا سوچو چونک تم سے مل کر کتنا خوش ہوگا۔"

مگر ہم دونوں کو معلوم تھا کہ میرا دوبارہ اتنی دور آنا بہت مشکل ہے۔

"خدا حافظ کارمن،" میں نے کہا۔

"خدا حافظ ———" وہ کھڑکی میں سے سر نکال کر بہت دیر تک ہاتھ ہلاتی رہی۔ ٹیکسی صبح کاذب کے دھندلکے میں ایئرپورٹ روانہ ہو گئی۔

ہوائی جہاز تیار کھڑا تھا۔ میں کسٹم کاؤنٹر پر سے لوٹی تو پیچھے سے ڈون گارسیا کی آواز

آئی ــــــ نِک ــــــ میں ذرا سگار خرید لوں۔"

"بہت اچھا ڈیڈی ــــــ" یہ ہوزے کی آواز تھی۔

میں چونک کر پیچھے مڑی۔ ہوزے مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ "دیکھا۔ ہم لوگ کیسے ٹھیک وقت پر پہنچے!"

"ہوزے ــــــ" میں نے ڈوبتے ہوئے دل سے پوچھا ــــــ "تمہارا دوسرا نام کیا ہے؟"

"نِک ــــــ ڈیڈی جب بہت لاڈ میں آتے ہیں تو مجھے نِک پکارتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر میں ہوزے ہی کہلاتا ہوں۔ کیوں ــــــ؟"

"کچھ نہیں ــــــ" میں اس کے ساتھ ساتھ لاؤنج کی طرف چلنے لگی۔ "تم ــــــ امریکہ کیا کرنے گئے تھے؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہارٹ سرجری میں اسپیشلائیز کرنے ــــــ تمہیں بتایا تو تھا۔ کیوں ــــــ؟"

"تم ــــــ کبھی تم نے ــــــ تم نے ــــــ"

"کیوں ــــــ؟ کیا ہوا ــــــ؟ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں ــــــ" میری آواز ڈوب گئی۔ لاؤڈ اسپیکر نے یکسانیت سے دہرانا شروع کیا۔ "پین امریکن کے مسافر ــــــ پین امریکن کے مسافر ــــــ"

"ارے ــــــ! روانگی کا وقت اتنی جلدی آگیا؟" نِک نے تعجب سے گھڑی دیکھی ڈون کارسیا سگار خرید کر شفقت سے مسکراتے میری طرف آئے۔ میں نے دونوں باپ بیٹوں کا شکریہ ادا کیا۔ انہیں خدا حافظ کہا اور تیزی سے مسافروں کی قطار میں جا ملی۔

دوڑتے ہوئے طیارے کی کھڑکی میں سے میں نے دیکھا۔ ڈون کارسیا اور نِک نیچے ریلنگ پر جھکے رومال ہلا رہے تھے۔ طیارے نے زمین سے بلند ہونا شروع کر دیا۔

یہاں سے بہت دور، خطرناک طوفانوں سے گھرے ہوتے پورپی سمندر میں ہرے بھرے جزیروں کا ایک جھنڈ ہے جو فلپائن کہلاتا ہے۔ اس کے جاگتے جگمگاتے دارالسلطنت منیلا کے ایک بے رنگ سے محلے کی ایک شکستہ عمارت کے اندر ایک بے حد چپٹی ناک اور فرشتے کے سے معصوم دل والی فلپینو لڑکی رہتی ہے جو اپنے بچے کے لئے کھلونے جمع کر رہی ہے اور اپنے خدا کی واپسی کی منتظر ہے جس کی ذات پر اسے کامل یقین ہے۔

ایک مکالمہ

الف : گرمیوں کا مہینہ جا رہا ہے۔ ہم ایک قدم اور قبر کی طرف بڑھا چکے ہیں۔ دوپہر کو بگولے اٹھتے ہیں۔ غریبوں کے محلوں میں لوگ دھڑا دھڑ مر رہے ہیں۔

ب : سُنا ہے بڑی سخت وبا پھیلی ہے۔

الف : ہاں۔ وبا پھیلی ہے اور لوگ مرتے ہیں۔ اگر نہ مریں تو دنیا کی آبادی اور بڑھ جائے اور مزید گڑبڑ پھیلے۔

ب : پہلے ہی کیا کم گڑبڑ ہے۔

الف : خدا سے اُمید ہے پچاس لاکھ تو مر ہی جائیں گے۔

ب : اتنے بہت سے۔

الف : تب بھی کمی نہیں آئے گی دنیا بھری پڑی ہے۔

ب : خصوصاً ایشیا۔

الف : زیادہ تر ان لوگوں کو مرنا چاہیئے۔ جو بالکل بے کار ہیں۔ تم نے ان کے مکان دیکھے ہیں۔

ب : نہیں۔

الف : ناقابل یقین۔ یہ لوگ گندگی میں زندہ رہتے ہیں۔ مکھیوں اور بھنگوں کی طرح اور مکھیوں کی طرح مرتے ہیں۔ ان کو شرم بالکل نہیں۔

ب : انہوں نے خدا کی حسین دنیا کو تباہ کر دیا ـــــ اس قدر غلاظت۔

الف : ہاں۔ میں نے ایک روز ان کے لیڈر سے کہا کہ شفق کی سرخی اور پھولوں کے حسن کو

دیکھ کر ایمان تازہ کرے مگر وہ اسی طرح ٹرّاتا رہا۔

ب : کوئی اچھی خبر سُناؤ۔

الف : اچھی خبریں بہت کم ہیں۔ تم کل کہتے تھے۔ زلزلہ آنے والا ہے۔

ب : جو بات کی منحوس۔ میں نے استعارہ استعمال کیا تھا۔

الف : "اولڈ آرڈر" ابھی سالم اور محفوظ ہے؟

ب : جب تک عبدل موجود ہے اولڈ آرڈر محفوظ رہے گا۔

الف : عبدل کا ہمیں ممنون ہونا چاہیئے۔ میں اسے دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

ب : تم آج کل گھر میاں کہاں گذارتے ہو؟

الف : بڑا پرابلم ہے۔ پچھلے سال ویزا لے کر منسوری گیا تھا۔ مگر وہاں جا کر اور پور ہوا۔ دنیا بدل چکی ہے۔

ب : ٹھیک کہتے ہو۔

الف : دنیا بدل گئی ہے اور ہم بھی۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ دنیا کس طرح بدلی۔ کیا ہم اس کی کایا پلٹ کو نہیں روک سکتے ——— تم میرا مطلب سمجھتے ہو ——— ؟

ب : ہاں۔ مگر تم بہت خوف زدہ ہو۔ اتنا گھبرانے کی بات نہیں۔ اب بھی کچھ نہیں کھویا بلکہ کچھ بھی نہیں کھویا۔

الف : لڑکیاں تک بدل گئی ہیں۔ میرا مطلب سمجھتے ہو؟

ب : ہاں! لیکن ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہیئے۔

الف : میں بیگمات کا ممنون ہوں۔

ب : آہ بیگمات ——— ! بڑی دلآویز ہستیاں ہیں۔

الف : اُن کے دم قدم سے یہ آرڈر قائم ہے۔ عبدل اور بیگمات ———

ب : اور ینگ جمی ———

الف : اور ینگ جی ـــــ (رُک کر) وہ کون ہے ؟

ب : ینگ جی میرا چھوٹا بھائی ہے۔ تم کو اس سے ضرور ملنا چاہیئے اولڈ آرڈر کا نیا ورژن اس کے دم قدم سے قائم ہے۔

الف : ینگ جی کیا کرتا ہے ؟

ب : سول سروس۔ اوکسفرڈ (انڈر کولمبو پلان) ایک سال امریکہ (فل برائیٹ) اسپورٹس ـــ ٹینس ـــ مشغلے سمفنی کے۔ ایل۔ پی ریکارڈ جمع کرنا۔ سابق سندھ کا بڑا ہوشیار سویلین سمجھا جاتا ہے۔

الف : آہ ـــــ میرے مرحوم چچا بھی بالکل ایسے ہی تھے۔ اوکسفرڈ اسپورٹس میں ہاکی اور ٹینس۔ سمفنی کے ایل۔ پی ریکارڈوں کے بجائے ان کو چیتے کے شکار کا شوق تھا۔ سی۔ پی کے بڑے ذہین سویلین سمجھے جاتے تھے۔

ب : ینگ جی نے ان کا تذکرہ اکثر اپنے سینئر افسروں سے سنا ہے۔ ان کو وہ اپنا آئیڈیل سمجھتا ہے۔ خصوصاً وہ واقعہ جب انہوں نے ـــــ

الف : جب انہوں نے بارہ سنگھا پور میں کانگریسیوں کے جنگلی ہجوم پہ گولیاں چلوائی تھیں۔

ب : ہاں اور وہ واقعہ بھی جب انہوں نے سن بیالیس میں آدھے ضلع کو جیل بھیج دیا تھا۔

الف : آہ ـــ وہ زمانے خواب و خیال ہو گئے۔ جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ شیر ول ہوتے تھے۔

ب : اب بھی وہ زمانے موجود ہیں۔ ہجوم کی ذہنیت کہاں بدلی، ہجوم ابدی ہے۔

الف : ہاں۔ ہجوم ابدی ہے۔

ب : جس طرح جنگل اور شیر، چیتے اور شکاری ابدی ہیں۔

الف : میں ینگ جی سے ضرور ملوں گا۔

ب : اور کوئی گیت شپ سناؤ۔

الف : کیا ـــــ سناؤں سارے موضوع ختم ہو گئے۔ میرا دل اُچاٹ ہو چکا ہے۔

ب : کیا تمہارے لاشعور میں کوئی پیچیدگی ہے؟ ـــــ کیا تم کو اندھیرے اور گہرائی اور وسعت، اور سناٹے سے ڈر لگتا ہے۔ یا مجمع اور تنگ جگہوں اور نیچی چھتوں اور اجنبیوں اور عورتوں اور بچوں اور کتوں سے تمہارا دم گھبراتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو ـــــ

الف : مجھے ہجوم سے نفرت ہے ـــ باہر دیکھو وقت کھسکتا جا رہا ہے۔ وقت کے لئے ساری تشبیہیں بے کار ہیں۔ وہ لنگڑا یا اندھا یا بے حس نہیں۔ وہ بہت مکار اور دغا باز اور چار سو بیس ہے۔ میں بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں۔ دیکھو ایک سال اور گزر گیا۔ یہ جون کا مہینہ ہے۔

ب : یہ جون کا مہینہ ہے۔ یہ گیت کا موضوع ہو سکتا ہے۔ تم اس کا مرثیہ بنا سکتے ہو۔ تمہاری پریشانی کی کوئی ایک وجہ ہے ـــــ؟

الف : مجھے لوگ "ٹائپ" سمجھتے ہیں۔ اخبار والے، مصنف اور ڈرامہ نگار اور واعظ اور نقاد۔ تم سمجھتے ہو میں ٹائپ ہوں؟ کمزور بزدل ڈرپوک ہوشیار چالاک سمجھ دار کامیاب انسان۔ جس نے نوجوانی میں خواب دیکھے اور دھکے کھانے کے بعد صراط المستقیم پکڑی۔ اور جسے اب بھی چین نہیں۔ کیوں کہ اب اس کا ہاضمہ خراب ہے اور مستقل اکتاتا ہے اور عمر نکلتی جا رہی ہے۔ میں کیسا واہیات "ٹائپ" ہوں۔

ب : تمہارے بغیر دنیا کی گزر نہیں۔ تم دنیا کی مشین کو چلاتے ہو۔

الف : میں ـــــ؟ میں ـــــ؟

ب : ہاں۔

الف : لوگ جنہوں نے مجھے ٹائپ بنایا ہے کہتے ہیں کہ میں بے حس ہوں اور انسانیت کا مذاق اُڑاتا ہوں اور جنگ میں میرا فائدہ ہے اور

ب : لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔

الف : کارخانوں سے لوگ خالی ناشتے دانوں کی میلی پوٹلیاں باندھے، چیونٹوں کی طرح لوٹ رہے ہیں۔ کلرکوں کی قطاریں سر جھکائے پیلی بارکوں کے سامنے بسوں کے انتظار میں کھڑی ہیں۔ دو گھنٹے سے یہ سب اسی طرح کھڑے ہیں۔ یہ گھر کیوں نہیں جاتے ــــ؟ چائے خانوں میں دھواں بھرا ہے۔ فٹ پاتھ پر سونے والے جمع ہو رہے ہیں، شام ہو گئی۔

ب : اس وقت بھی لوگ مر رہے ہوں گے۔

الف : یقیناً۔ ہر لحظہ، ہر سیکنڈ، لوگ مرتے ہیں۔

ب : اور خود سے نہیں۔

الف : مولانا عبدالمتین ندوی نے کہا ہے کہ سب مشیتِ ایزدی ہے۔

ب : کہ چند انسان دوسرے انسانوں کو ماریں یا اُن کی موت کا حیلہ بنیں؟

الف : سب اُس نیلی چھتری والے کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس کے حکم بنا پتہ نہیں ہل سکتا۔

ب : اور سُناؤ کیا حال چال ہیں۔

الف : مجھے کچھ شکوک نے گھیرا ہے۔

ب : مکڑی بیٹھی جالا بُن رہی ہے۔ مکڑی بیٹھی جالا بُن رہی ہے۔

الف : اس مکڑی سے بچوں؟

ب : ہاں ــــ حالات اتنے خراب نہیں۔ ابھی تمہارے لئے بہت کچھ باقی ہے۔

الف : شاید ــــ مگر میں بہت ناخوش ہوں۔ میرے آغاز میں میرا انجام ہے، وغیرہ ....

ب : بکو مت۔

الف : باغ میں دوسری آوازیں گونج رہی ہیں۔ کیا ہم اُن کا تعاقب کریں؟ ــــ

جلدی کرو ـــــ جلدی ـــــ چڑیا نے کہا ـــــ،

ب : بکواس مت کرو۔

الف : "آگے بڑھو مسافرو۔ تم جو سوچتے ہو کہ سفر بس ہو۔ تم وہ نہیں۔ جس نے بندرگاہ کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھا۔ نہ تم وہ ہو جو دوسرے کنارے پر اتر و گے۔ یہاں اور دوسرے کنارے کے درمیان وقت، معطل ہو چکا ہے۔"

ب : چُپ رہو۔ اور باہر دیکھو۔ رات ہو رہی ہے۔

الف : لوگ گھروں کو جا رہے ہیں۔ سر جھکائے حسبِ معمول، یہ سر اُٹھا کر کیوں نہیں چلتے؟ تمہارا مطلب ہے اُن کی قسمت میں کوئی خوشی نہیں؟ یہ یونہی جیے جائیں گے؟

ب : اور مر سے جائیں گے۔

الف : تم نے پھر موت کا خیال دلا دیا۔ میں خود ہر گھڑی موت کو یاد کرتا ہوں۔ میرا دماغ چکراتا ہے ـــــ میں اپنی رسّی کے آخری سِرے پر ہوں۔ میرے آغاز میں ـــــ

ب : مجھے تمہاری طرف سے فکر ہو گیا۔

الف : مجھے ذرا ذرا سی بات پر غصّہ آتا ہے اور غصّے کے لئے کیا کم باتیں ہیں۔ میرا خون کھولتا رہتا ہے۔ میں مجموعی طور پہ زندگی سے بیزار ہوں۔

ب : تم کیوں نہیں مانتے کہ جو ہوتا ہے وہی ہوگا۔

الف : یہ بے وقوفی کی بات ہے جو ہونا ہے ظاہر ہے وہی ہوگا اور کوئی بات ہونے والی ہو گی تو ظاہر ہے وہ کوئی اور بات ہو گی۔ وہ نہ ہو گی جو ہونی ہے۔

ب : بےکار میں مٹیا فزیکل نہ بنو۔

الف : تم سمجھتے ہو دنیا کے مسائل اور پریشانی کی بنیادی وجہ نفسیاتی نہیں اقتصادی ہے؟

ب : پریس کی مشینیں گھڑ گھڑ چل رہی ہیں۔ خبریں بھیانک ہیں، اس لنگڑے اخبار فروش کو دیکھو جو دیوانوں کی طرح چلّا رہا ہے۔

الف : یہ سمبلنہ کی دنیا ہے۔ مجھے ہر شے میں کوئی نہ کوئی سمبل نظر آتا ہے۔ میں ہمہ وقت سطروں کے درمیان پڑھتا ہوں۔

ب : تم نے جو کچھ پڑھا ہے بھول جاؤ۔ ہمارے ماہرین تعلیم اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ کہ تعلیم بے کار ہے۔

الف : وہ ٹھیک کہتے ہیں ہمیں کتابوں کے بجائے بندوقوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ قوم کے نونہالوں کو کتابوں کی جگہ بندوقیں دو ـــــ تاکہ وہ مجاہد بنیں ـــــ مردِ مومن، شاہین۔

ب : تعلیم ـــــ یہ سب غریبوں کی افیم ہے۔ غریبوں کو افیم مت دو۔ اسے کھا کر ان کا دماغ چکرا جاتا ہے! ان کی عقل چرخ ہو جاتی ہے!!

الف : مگر یہ اتنا چلاتے ہیں۔

ب : چلّانے دو۔ تم نے ان کتوں کو دیکھا ہے جو سرد راتوں میں چاند کے نیچے بیٹھ کر آسمان کی سمت منہ اُٹھائے اُٹھائے روتے ہیں؟

الف : چاند کی تمنا میں؟

ب : نہیں۔ ان کو محض سردی لگتی ہے۔

الف : میرے دادا نواب بہادر جھپسٹ گڑھ کے پاس درجنوں ایک سے ایک اعلیٰ شکاری کتّے تھے۔ آہ جب مجھے اپنے محل کا خیال آتا ہے جو میں وہاں چھوڑ آیا ـــــ

ب : بکو مت۔ اس من گھڑت محل سے چوگنے بڑے محلات تم یہاں بنوا چکے ہو۔ مگر پیچھے کے آنسو مت بہاؤ۔

الف : کیا تم مجھے تھوڑی سی جذباتی عیاشی نہ کرنے دو گے؟

ب : تم کو کسی بات کا غم نہ ہونا چاہیئے۔ تم نے ایک ایسی دنیا بنائی ہے۔ جس میں بچّے

بھیک مانگتے ہیں اور نوجوان عورتوں کی عزت محفوظ نہیں اور نوجوان لڑکے ٹی۔ بی میں مبتلا ہیں ـــــ اور ـــــ

الف : یہ دنیا ہمیشہ سے تھی۔ میں نے اس میں محض چند کل پھندنے لگا دیئے ہیں ـــــ ایسی الٹرا ماڈرن طرزِ تعمیر کی کوٹھیاں، ایسے کلب، ایسے جشن پہلے تم نے کبھی خواب میں بھی دیکھے تھے ـــــ؟ اور طویل موٹروں کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔

ب : بیس سال پہلے ایک اسپین تھا۔ آج چاروں طرف اسپین ہیں۔

الف : میرا ایک عزیز دوست جو اس زمانے میں کیمبرج میں پڑھتا تھا، لڑنے گیا تھا۔ لیکن اب تو اسے تائب ہوئے بھی زمانہ گزر گیا۔

ب : اب ہنسی اور آنسو دونوں بے کار ہیں۔ ہر چیز کا سمے بیت چکا ہے۔

الف : سنا ہے کلچر میں بڑی طاقت ہے۔ وہ ہمیں بچا لے گی۔ آج کل اس کا بڑا چرچا ہے اس میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔

ب : یورپ میں گوتھک اور بروک کیتھڈرل بمباری کا نشانہ بن گئے۔

الف : اصول کیا شے ہے۔ اصول کون طے کرے گا۔

ب : یہ سوال کسی وید انیتسٹ سے کرو کہ کون کس کا فیصلہ کرے گا۔ مگر الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو چلا ہے۔

الف : میں فیصلوں سے ڈرتا ہوں۔

ب : تم اپنے سے کمزوروں کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہو۔

الف : اور مجھ سے زیادہ طاقتور میری قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔

ب : ایک وقت تھا کہ زندگی آسان تھی۔ گو ایک حد تک پراونشل تھی۔

الف : ہاں زندگی میں الجھنیں نہ تھیں اور سیاسی حد بندیاں۔ مجھے وہ زمانہ یاد ہے، جب ۲ ستمبر ۳۹ء تک ـــــ ہانگ کانگ سے ٹرین میں بیٹھو تو وہی ٹرین سیدھی لندن پہنچا دیتی تھی۔ زندگی آسان تھی۔

ب : ہاں! تب ہر شے اپنی اصلیت سے سو گنا بڑی نہ ہوئی تھی، لوگ جن کا ذہن سینکڑوں سے آگے نہ پہنچ سکتا تھا، اب لاکھوں اور کروڑوں کے وارے نیارے کرتے ہیں۔ اب ہر شے انلارجڈ ہے، اور آؤٹ آف فوکس۔ شہر جل رہے ہیں۔ کھیتوں میں آگ لگی ہے۔ مگر کسی کو نہ شعلے نظر آتے ہیں نہ دھواں۔

الف : اب کیا ہوگا؟

ب : پانسے تیار ہیں اور پھینکے جانے والے ہیں۔

الف : بارود کے دھوئیں سے میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ مجھے ہر شے میں بارود کی مہک آ رہی ہے۔

ب : ہیومینسٹ، کویکر، ویدانیتسٹ، تھیوسوفسٹ، برطانوی لبرل، لفٹ ونگ انٹلکچوئل، امن پرست، روشن خیال مولانا جو روس میں اسلام پر مضمون لکھتے ہیں۔ اسکول ٹیچر قصباتی ڈاکٹر، یونیورسٹی کے پروفیسر جو کم تنخواہیں لے کر علم اوڑھنے بچھاتے اسی طمانیت میں زندگیاں ختم کر دیتے ہیں کہ وہ غالباً نوبل پرو فیلشن میں تھے، اور وہ جن کو (چونکہ انہوں نے ہائیڈروجن بم کے خلاف احتجاج کیا) سنکی اور ہمسفر، اور دشمن کے ایجنٹ اور مفسد، سمجھا گیا اور بوڑھے یہودی سائنسداں، اور وہ بوڑھا مسلمان عالم جو قوم پرست ہے اور اعظم گڈھ میں، یا بہرائچ میں، یا گورکھپور میں چپ چاپ بیٹھا ہے اور عورتیں جن کے لڑکے ــــــ

کوریا میں
ڈین بین پھو میں
کینیا میں
ملایا میں
انڈونیزیا میں
اسرائیل اور اردن اور لبنان اور شام اور مصر اور ہندوستان اور پاکستان کی سرحدوں پر۔

الجزائر میں
مراکش میں
سُرمآندی کے کنارے

مارے گئے، اور مارے جا رہے ہیں، ہر لحظہ، ہر منٹ، صبح، شام،
اور ان سب نے نعرے لگائے تھے کہ انہیں امن چاہیئے۔ کیوں کہ
جب یورپ کی جنگ ختم ہوئی جس میں آج مرنے والے لڑکوں کے باپ موت
کے گھاٹ اترے تھے، اس وقت ان کی ماؤں سے کہا گیا تھا۔ کہ تم نے دنیا کو
محفوظ بنانے کے لئے یہ قربانی دی ہے۔ تاکہ تمہارے بچے امن کی دنیا میں زندہ
سلامت رہیں۔

الف: تم مجھ کو یہ سب کیوں سُنا رہے ہو؟

ب: اور یہ بچے بڑے نہ ہونے پائے تھے کہ کِٹ بیگ کاندھوں پر لاد، مارچ کرتے نئی
خندقوں کی طرف چل پڑے اور گو اس وقت آفیشیل طور پر دنیا میں کوئی جنگ جاری
نہیں ہے اور خوبصورت تھائی، اور جاپانی اور فرنچ اور پاکستانی اور ہندوستانی
گائیڈ لڑکیاں نیویارک میں ایوان کی عمارت کی سیاحوں کو سیر کرا رہی ہیں۔

الف: سڑکیں جگمگا اٹھیں۔ کاریں۔ بدوضع ہیبت ناک بسیں۔ موٹر رکشائیں۔ گرمی جیس
نئے دولت مندوں کی طمانیت، فیشن ایبل شاپنگ سنٹر، کے سیکنڈ ریٹ ماحول میں
دم گھٹا جا رہا ہے۔ سینماؤں پر میری لین منرو کے قد آدم جسمے سب سے بلند تر ہیں۔
سیاہ فام کمرانی اور گوانی لڑکے جینز پہنے روک اینڈ رول کی دُھنیں گنگنا رہے ہیں۔
بیگمات نے خوبصورت سوتی ساڑھیاں پہننا شروع کر دی ہیں جو وہ "انڈیا" سے
خرید کر لاتی ہیں۔ بالوں کے پونی ٹیل، بنائے شلواروں پر نیچی نیچی قمیص پہنے لڑکیاں
سبزے پر بیٹھی کیا سوچتی ہیں (اگر وہ کچھ سوچتی ہیں) میں ان کے خیالات کے لئے ایک
(PENNY) پینی دوں گا۔

ب: لاتعلق رہو۔ تجرید اصل شے ہے۔ تمہیں بیان میں جذباتی نہ ہونا چاہیئے۔

الف: دنیا کی گاڑی اب چلائی نہیں جاتی۔ دنیا چاروں اور سے ٹوٹ ٹوٹ کر میرے ارد گرد گر رہی ہے۔

ب: ہر وہ چیز جسے ہم بچپن سے غلط سمجھتے آئے تھے، صحیح ثابت کر دی گئی ہے۔ صحیح غلط ہے اور غلط صحیح۔ جیو ہتھیا مہا پاپ نہیں ہے۔ اسی کے ذریعے ملکوں کے نقشے بدلے جاتے ہیں۔ سرحدوں کی لکیریں بہت اہم ہیں۔ آدمی کی ان لکیروں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔ اور مارو۔ مزید آدمیوں کو مارو ——— مارو ———

الف: کیا ہوا۔ کہیں بلوہ ہو گیا ——— غنڈہ گردی ——— پولیس کو فون کرو ——— یا ممکن ہے ڈاکو گھس آئے ہوں۔ یہ شہر مشرق کا سب سے کرپٹ، دارالسلطنت ہے، اسے مشرق کا شکاگو ہونے کا فخر حاصل ہونے والا ہے۔ غیر ملکی جرنلسٹوں کو بلاؤ تاکہ میں ایک، بیان دوں۔

ب: جان جیرلڈ ایمیل اسٹینفرڈ کا کھلاڑی، فلاڈلفیا میں ایریا ٹریننگ لے کر پہنچا۔ اب اس کو سب معلوم تھا۔ افغانوں کے رسم و رواج۔ ریاست چترال کا بجٹ۔ چاٹگام کی ٹریڈ یونینوں کا احوال۔ سندھ کے ہاریوں کی کہانی اور پیلس پالیٹکس کی ساری تفصیلات اسے ازبر تھیں۔ بالفاظِ دیگر وہ بڑا جیّد قسم کا مڈل ایسٹ ایکسپرٹ تھا۔ اس نے میرا امتحان لینا چاہا۔ اس نے سوال کیا ———

ہنگری کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ الجزائر کے متعلق کیا رائے ہے؟

——— میں نے جواباً پوچھا۔

ڈاکٹر عقاب آفاقی آٹھویں صدی کی فقہ پہ ریسرچ کر کے اوکسفرڈ سے لوٹا۔ تم کھوکھلے انسان ہو۔ تم سب جو اکھٹے ہو کر روتے ہو ——— کیا تم کو نہیں معلوم کہ اسلام میں سارے دکھوں کا علاج موجود ہے؟

لہٰذا میں نے جماعت اسلامی کا ایک مصوّر رسالہ پڑھنا شروع کیا۔ مگر غور سے پڑھا تو معلوم ہوا کہ اسے کامریڈ صفت حسن ایڈٹ کرتے ہیں۔ تاکہ انقلاب اسلام کے راستے داخل ہو۔ مجبوری سب کچھ کروا دیتی ہے۔

الف : مجھ میں اتنی ہمت کیسے ہوئی کہ میں دنیا کے معاملات میں کہ وڑوں انسانوں کی زندگیاں سنوارنے بگاڑنے میں اخلاقی، سماجی اور مذہبی تصورات گھڑنے میں دخل دوں۔ انتہائی آفاقی اہمیّت کے مسائل میں اپنی ٹانگ اڑاؤں۔ میں نے یہ سب کس طرح کیا۔ میں صرف ذاتی نفع چاہتا تھا اور نام و نمود۔ کیونکہ انسان اگر اقتدار حاصل کرنے سے خائف ہے تو اسے چاہیئے کہ سر گھٹا کر سادھو بن جائے۔ اقتدار۔ استحکام، طاقت۔ ضابطہ۔ نظام۔ ضمیر۔ اصول ـــــ یہ الفاظ میرے سامنے سے ہٹاؤ۔ مجھے صرف بادل چاہئیں اور پتوں کی سرسراہٹ ـــــ

ب : مگر پھانسہ پھینکا جا چکا تھا۔ اقتدار تمہارے حصّے میں آیا ہے۔ تم طاقتور اور تمہاری طاقت دوسروں کے لئے، ہر انسان کے لئے نقصان دہ ہے، سوا تمہارے ـــــ اس وقت، جو تم یہاں بیٹھے ہو اور سامنے سبزے پر لڑکیاں ہنس رہی ہیں اور بچّے کھیل رہے ہیں اور موسیقی بج رہی ہے۔

عین اسی منٹ تمہاری وجہ سے صحراؤں میں اور جنگلوں میں اور بستیوں میں بارود کے گولے پھٹ رہے ہیں اور انسانی جسموں کے پرخچے اُڑ رہے ہیں۔

الف : یہ منظر کشی کر کے مجھے دھمکانے کی کوشش مت کرو۔

ب : میرے سامنے ایک پولیس افسر آتا ہے۔ جو پچھلے اتوار کو موں مارتر کے ایک کیفے میں بیٹھا سارتر پڑھ رہا تھا اور آزادی کا حامی تھا۔

الف : اب میں بھی دیکھ رہا ہوں ـــــ وہ حکم دیتا ہے کہ اپنے کپڑے اتار دو ـــــ

ب : اور وہ اپنے کپڑے اتار دیتی ہے [1]

ابھی بیگمات دوسرا رقص کریں گی۔ سازندوں سے کہو۔ ارتھاکٹ کا کوئی نغمہ

---

[1] الجزائر میں ہر فرانسیسی فوجی یا پولیس افسر ہر الجیرین عورت کو حکم دے سکتا تھا کہ وہ اپنے سارے کپڑے اتار کر ثابت کرے کہ اس نے اسلحہ یا بم نہیں چھپائے ہیں۔

بجائیں۔ یا سیمبا۔ بیگم صاحبہ کے لئے ایک شیری۔

الف: عبدل تم آ گئے ــــ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا مجھے بُرے بُرے خواب دکھلائی دیتے ہیں۔ ہول آتا ہے ــ عبدل مجھے لگتا ہے تم مجھ سے چھٹنے والے ہو ــ عبدل میرے لئے ایک کافی ــــ بیگم صاحبہ کے لئے ڈرائی مارٹینی۔ عبدل کیا یہ بھی روایت ہے۔ کہ تمہارے دم سے اولڈ آرڈر قائم ہے؟ جیسے یہ روایت ہے کہ کسان آزاد اور خوش باش ہیں۔ طالب علم مفلس اور ذہین ــ لڑکیاں باعصمت اور وفادار۔ میں تمہارے چہرے پر جھریاں دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری داڑھی بالکل سفید ہو گئی ہے۔ کیا تم کو بخشش کم ملتی ہے۔ حالانکہ تمہارے نئے امریکن صاحب لوگ تمہارے پرانے انگریز صاحب لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ دریادل ہیں ــــ یہ بھی ایک روایت ہے؟

ب: سائے کی طرح چلتا ہوا عبدل بیگم صاحبہ کے لئے ڈرائی مارٹینی لینے چلا گیا۔ پینٹری میں جا کر وہ اپنے آبدار سے کہے گا کہ بڑے صاحب آج معمول سے زیادہ اُداس ہیں۔

الف: ــــ جب میں باتیں کرتا ہوں مجھے لگتا ہے۔ میں کسی مردہ زبان میں بول رہا ہوں۔ لوگ مجھے سمجھ نہیں سکتے۔ سنسکرت یا پہلوی یا لاطینی ــ الفاظ کے معنی بدل گئے ہیں۔

ب: والٹس۔ بیگم صاحبہ کا پسندیدہ رقص ہے۔ آج کل لوگ سوائے اور تھری ہنڈرڈ میں کون سا ناچ ناچ رہے ہیں؟

الف: بہت سے لوگ ہیں (اور تمہیں پتہ ہے کہ کون) جن کو نہ میری طرح ڈراؤنے خواب آتے ہیں نہ جن کا دل ہولتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی وہی سب کر رہے ہیں جو میں کرتا ہوں تمہارا خیال ہے یہ محض اوورورک کا نتیجہ ہے؟

ب: بیگم صاحبہ کو ایک اور ڈرائی مارٹینی دو۔

الف: غدار اور جاسوس اور مجرم اور قاتل اور جیلر اور پھانسی کی رسّی اور کوٹھری کی

سلاخیں اور بے عزّتی کی زندگی اور بے عزّتی کی موت، اور جگ ہنسائی اور رسوائی اور اس طرح کے تصوّرات کا گویا ایک بیلے ہے جو رات کو دیوار پہ میرے سامنے ہوتا ہے۔ اتنے قتل ہوئے، اتنوں پہ مقدمہ چلا۔ کس نے کس کو گھوُس دی۔ کس نے کون سا جال پھیلایا۔ جج رشوت کھا گیا۔ وکیل قتل کر دیا گیا۔ غلط آدمی کو جیل ہو گئی۔ مجرم ولایت سے نئی کار خرید لایا۔ علیٰ ہذا القیاس۔ میرے دماغ میں ہر سمے سنسنی خیز اخبار چھپتے رہتے ہیں۔ میرے ذہن کی ٹیلیکس پہ عجیب عجیب خبریں آتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے حفاظت کہیں نہیں ہے۔ میں ہر وقت خطرے میں ہوں۔ مکانات، روپیہ، شہرت، عزّت، تجربے سب لایعنی ہیں خصوصاً ذاتی جائیداد یعنی پرائیویٹ پراپرٹی۔ بالکل پانی کا بُلبُلا سمجھو اسے۔ نہ جانے کس وقت میں مر جاؤں اور یہ سب دھرا رہ جائے کس وقت، میں زندہ ہی ہوں مگر میرے ہاتھوں سے یہ سب نکل جاتے۔ بڑا دل ہلتا ہے۔ حفاظت نہیں ہے۔

ب: آبادیوں کی آبادیاں، ملک کے ملک کنسنٹریشن کیمپوں میں تبدیل کر دیئے گئے۔ پہلے ایک بیلسن تھا۔ اب ہر طرف بیلسن ہیں۔

الف: میں تو صرف اتنا چاہتا تھا کہ جب میں جانے لگوں، تو طمانیت کے ساتھ اتنا کہہ سکوں کہ شکریہ یہ دینا والو۔ میں ایک اچھی دعوت میں آیا تھا۔ شکریہ۔

ب: ان لوگوں سے کہو جو سال کے سال نو کی مبارک باد کے کارڈ تیار کرتے ہیں کہ ایک بڑا الاؤ بناؤ۔ اور ساری تہنیتیں، ریاکاری کی ساری "بہترین خواہشوں" سمیت اس الاؤ میں جھونک دو۔

الف: اس کھڑکی میں سے جھانکتا میں اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں، آج کی رات میں یہ ہوں۔

ب: بہت سے لوگ تاریخ کی باتیں کرتے ہیں اور فلسفے کی اور اخلاقیات اور مذہب کی اور میں اُن کو حیرت سے دیکھتا ہوں۔

الف: عمر، خالد، طارق، اورنگ زیب، ٹیپو، سراج الدولہ، سید احمد، جمال الدین، سرسیّد،

شہزادہ علی خاں، بادشاہی مسجد، شالیمار باغ، ملتان کے مقبرے شہنشاہ، مزید مسجدیں

اسلام اسلام اسلام

ب : بیگم صاحبہ فرانس سے انٹیریر ڈیکوریشن میں ڈگری لے کر آئی ہیں۔ پھولوں کی آرائش کے فن پر ان کا مطالعہ وسیع ہے۔

الف : اپنی حماقتوں کو اپنی ڈھال اپنا علم اپنا نقارہ بنا کر (اور، ہم سب، تم جانتے ہو کہ کون) مارچ کر رہا ہوں۔ لفٹ رائیٹ لفٹ رائیٹ یہاں تک کہ مجھے خود یقین ہو چلا ہے کہ میں دنیا کا اہم ترین، عقل مند ترین انسان ہوں میں باقی دنیا پر فیصلے صادر کرتا ہوں میری رائے حرف آخر ہے۔ کون ہے جو میرے منہ آئے۔ تاریخ کے اہم فیصلے ہمیشہ احمقوں نے کئے ہیں۔

ب : بیگم صاحبہ آپ کو شاعری سے دلچسپی ہے؟ خوب۔ آیئے میں آپ کو چند اشعار سناؤں۔ پسند نہ آئیں تو تکلفاً تعریف نہ کیجئے گا۔ کیونکہ اشعار میرے نہیں۔ بیگم صاحبہ۔

جہاں الفاظ بھنکارتے ہوئے ناگ ہیں یا مکھیاں جو مسجد مندر
اور مردہ گھروں میں بھنبھناتے ہوئے، انسانوں کی غلطی سے
دیوانہ وار

اپنا پیٹ بھرتی ہیں

لیکن پھر بھی ہر لاش ابدی ہے
جہاں برگد کا درخت اپنے پتوں کی قسمت پر رو رہا ہے۔
اور فٹ پاتھوں پر خون اور زخموں کے پھول کھلتے ہیں
چنانچہ بدھ ستوپوں اور مغل مقبروں اور مدراؤں اور
ساریوں اور مقدس صحیفوں کے منتروں میں چھپے ہوئے
سارے حسن کے باوجود جو روح کی تاریک رات کو روشن
کرتا ہے۔
انحرافات کے اس مہلک بھنور میں ہماری مختصر سی رات

کو جگہ نہ مل سکی۔

یہ بھنور جہاں جیتے ہوئے، مسکراتے ہوئے،
مارتے اور مرتے ہوئے،
ان کی زندگی کی تمنّا موت کی تمنّا سے تقریباً ہمکنار
رہتی ہے۔
اور یہ سارا رنگ و بو ایک مسلسل بے کیفی میں تبدیل ہو
جاتا ہے جہاں نہ عود سلگتا ہے۔
نہ کنول کھلتے ہیں۔
یہ حقیقت تھی جسے اب ہم نے دیکھا
یہ قیامت تھی۔ اس تاریک غار میں جو کیڑے رینگ رہے
ہیں وہ ہم ہیں۔
ہم ہمیشہ تھے۔
اور ہم نے ہمیشہ آلتی پالتی مار کر صرف ماورا پر
دھیان کیا۔
لیکن اب یہ منظر ہمارے بہت قریب ہے۔ ہمارے
سامنے ہے[1]۔

الف: تم نے بیگم صاحبہ کی طبیعت مکدر کر دی۔ تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو۔ کیا تمہیں خوف خدا نہیں کیا تم یہ نہیں جانتے کہ تم اپنے حق میں کانٹے بو رہے ہو اور سب دروازے تم پر بند ہو جائیں گے؟ تم جو اس ڈرامے میں حصّہ لینے سے انکار کرتے ہو ہم زرتار شامیانوں کے نیچے ایک بہت بڑی بھیڑ دھسان خلقت کی خاطر اسٹیج کر رہے ہیں۔ اتنے سارے اسٹیج ہم نے بنائے ہیں۔ یہ پارلیمنٹ ہے۔ یہ یونیورسٹیاں ہیں۔

---

[1] لوئی مک نیس کی ایک نظم کا اقتباس۔

یہ کابینہ ہے۔ یہ عدالتیں ہیں، ہم نے اگر یہ ڈرامہ کامیابی سے نہ کھیلا تو ہماری بھیڑ یا دھسان خلقت کا دل ٹوٹ جائے گا اور وہ چونّی واپس کرنے کا مطالبہ کرے گی۔ ابھی سے وہ اکثر وقتاً فوقتاً ہوٹنگ کرنے لگی ہے — تم اگر ہمارے ساتھ شامل نہ ہو گئے تو تم پہ چوکسی سے نگرانی کی جائے گی۔ شاید تم کو معلوم نہیں کہ میں ہی تمہارا جج ہوں۔ میں ہی گواہ۔ میں تم کو کسی لمحے بھی مجرم ثابت کر سکتا ہوں۔ اب دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ ہو چکا ہے۔ میرے ہاتھ میں ترازو ہے۔ میں ہمہ وقت فیصلے صادر کر رہا ہوں۔ منتظر رہو جانے کس وقت جلاد آکر تمہارا دروازہ کھٹکھٹائے۔ سمے بہت کم ہے۔ جو کچھ کہنا ہے کہہ لو تم دنیا کے نام کوئی پیغام کوئی وصیت چھوڑنا چاہتے ہو؟ عنقریب تمہارا، ہم سب کا خاتمہ ہے۔

ب: مائی لارڈ۔ آپ کو جج کس نے مقرر کیا ہے اور آخری فیصلہ کس کی عدالت سے ہوگا۔

الف: خود میں نے اور آخری عدالت بھی میں ہی ہوں گا۔ خود کوزہ خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ — میں سب کچھ ہوں۔ ادارے جن میرے مظاہر بیکراں ہیں۔ میں ایماندار ہوں۔ تمہارے ایمان میں فتور ہے۔ میں محب وطن ہوں۔ ملک کے لئے کٹ مروں گا۔ خون کا آخری قطرہ سب سے پہلے میں ہی بہا دوں گا۔ تم غدار ہو۔ میرے آدرش بلند ہیں۔ تم کمینے ہو۔ مجھے حق ہے کہ میں آرام و آسائش سے رہوں۔ کیونکہ میرے کاندھوں پہ بڑی عظیم ذمہ داریاں ہیں۔ یہ زمینیں، یہ دریا، یہ وادیاں، یہ پہاڑ، یہ کھیت، یہ باغات، یہ شاہراہیں، یہ کارخانے، یہ بازار، یہ کھلیان، یہ کوٹھیاں، یہ بنکوں کی عمارات، یہ سب میری ہیں۔ میں ان کا اصل مالک اور حق دار ہوں، مجھے غصہ نہ دلاؤ ورنہ میں تم کو — میں تم کو — اوہ — میں کہتا ہوں تم اپنی اوقات کیوں بھول گئے۔ واپس جاؤ۔ نیچے اترو — اور نیچے — وہی جگہ تمہاری ہے۔ یہ محلے۔ یہ کوٹھریوں کی قطاریں۔ یہ بستیاں۔ یہ ٹاٹ اور چٹائیوں اور بانسوں اور ٹوٹی کھٹیوں کے انبار — کیا یہ سب تمہارے لئے کافی نہیں — ؟ اور تم کیا چاہتے ہو گورنمنٹ ہاؤس میں رہو گے؟ کیا گورنمنٹ ہاؤس تمہارے باپ کا ہے؟ گورنمنٹ

ہاؤس میرے باپ کا ہے۔

ب : میں ایک شخص کو جانتا ہوں جو فوج میں لیفٹیننٹ کرنل ہے۔ لیکن ولی اللہ ہوگیا ہے۔

الف : اچھا ــــ؟

ب : ہاں۔ اور وہ کہتا ہے کہ تصوف کی، یا جو کچھ بھی وہ ہوتا ہے، اس کی ساری منزلیں طے کر چکا ہے۔ اس کا قول ہے کہ وہ پچھلے پندرہ سال سے رات کو نہیں سویا۔ اور رات بھر جاگتا ہے یعنی عابد شب زندہ دار ہے۔ پورا پیرمنس سمجھو اُسے۔ اور اب اس میں اتنی طاقت ہے کہ اپنی چشمِ باطن کے ذریعے انسانوں کی جو اصلیت ہے اسے دیکھ لیتا ہے۔ یعنی کسی میس کی بار میں جاتا ہے تو اسے اسٹولوں پر سور اور گھوڑے اور خچر اور چوہے بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ڈرائنگ روم کے صوفوں پر اسے بکریاں اور بلیاں اور گدھیاں اور ہتھنیاں اور سیار دکھلائی دیتے ہیں۔

الف : اللہ اکبر۔ کیسا قیامت خیز تصوّر ہے۔

ب : جب وہ مجھ سے بات کرتا ہے تو اسے میری ظاہری انسانی شکل کے بجائے میری اصل صورت نظر آتی ہے گو اس نے آج تک مجھے بتایا نہیں کہ یہ کیسی صورت ہے۔

الف : حد ہے۔ ہماری فوج کی یہ حالت ہوگئی ــــ

ب : ہاں۔ صوفی اور ولی اللہ تو ہر جگہ پیدا ہوتے آئے ہیں۔

الف : میں اپنے آپ کو گیڈر سمجھتا ہوں۔

ب : میں تم کو گدھ کہوں گا جو ڈریس سوٹ پہنے ایک لمبی سی شاہ بلوط کی ڈائننگ ٹیبل کے سرے پر بیٹھا اونگھ رہا ہے اور منتظر ہے اور اس کے پنجوں میں ــــ

الف : تشبیہہ کو آگے نہ لے جاؤ۔ ورنہ میرے وحشت ناک خوابوں میں اضافہ ہوگا۔

ب : سارا ملک پارسیلوں کا ایک عظیم الشان وسیع، لق و دق برج خموشاں ہے۔ نیچے چونے اور تیزاب کا کھڈ ہے اور ہماری لاشیں پٹا پٹ اس میں گر رہی ہیں اور ہم اس کھاد میں تبدیل ہو رہے ہیں جس سے تمہارے لان کی مٹی کو زرخیز کیا جائے گا۔ تم مجھے اس آتش پرست پروہت کی مانند نظر آتے ہو جو سر تا پا سفید کپڑوں

میں ملبوس میری لاش پر وہی لگا رہا ہے۔ میری لاش تو ایسی ہے کہ کتا بھی اسے سونگھ کر چھوڑ دے۔

الف : بڑا زبردست جھکڑ چل رہا ہے۔ زرد اور سرخ اور سیاہ ریت میری آنکھوں میں جا گھسی ہے۔ میرا دماغ اب کام نہیں کرتا ——— کوئی ہے جو آکر مجھے بچائے۔

ب : ہم ایک ایسی دنیا میں زندہ ہیں جس میں ہر شخص ایک دوسرے پر جاسوسی کر رہا ہے۔ دوست دوست پر، افسر ماتحت پر، بھائی بھائی پر، تم کس کو مدد کے لئے پکارو گے؟

الف : جہاں ہم اور تم وقت میں خیمہ زن ہیں اور بڑی بھاری سیاہ آندھی اٹھی ہے۔ اور بگولے چکر کاٹ رہے ہیں ——— تمہیں پتہ ہے۔ میں نے ایک زمانے میں خواب دیکھے تھے۔ مدتوں چپکے چپکے دیکھا کیا۔

ب : پتہ ہے۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگوں نے اپنے خوابوں کو یونہی کھو جانے دیا ہے۔

الف : جنگل کی طرف ایک پہاڑی راستہ جاتا ہے۔ دونوں طرف دیوداروں کی گھاٹیاں ہیں جن پر نیلا کہرا منڈلا رہا ہے اور سرخ مکانوں کی چمنیں اور بارش سے بھیگے ہوئے پتھر پہ ایک بڑھیا بیٹھی ہے۔ وہ راہ گیروں کو خاموشی سے دیکھتی ہے۔ ایک اسکول کا لڑکا نیلے موزے پہنے بھاری بستہ پیٹھ پر لادے سیٹی بجاتا سیب کھاتا چڑھائی پر چڑھ رہا ہے ——— معصوم ——— بھولا بھالا ——— بارہ سالہ لڑکا ——— میں اکثر جاگتے میں وہاں واپس جانا چاہتا ہوں۔

ب : دیوداروں کے پیچھے تارا ہال ہے۔ چاروں اور کوہستانی گلاب مہک رہے ہیں۔ رات گئے میں انجانی موسیقی سننے کے لئے پچھلے برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑا ہوں۔ جو بٹاویا کے ریڈیو اسٹیشن سے آرہی ہے۔ یہ ۳۶ء ہے۔ میں متحیر ہوں آسمان پہ تارے کھلے ہیں۔ ہوا میں پہاڑی صندل کی مہک ہے۔ مجھے ابھی نہیں معلوم کہ ابھی مجھے دنیا میں کیا کیا جھیلنا ہے ——— میں وشوا بھارتی جانا چاہتا ہوں۔ میں صرف وشوا بھارتی جانا چاہتا ہوں۔

الف : اب میرا خواب سنو ——— مگر رہنے دو۔ سب بیکار ہے۔

الف اور ب: (اکٹھے) ہم مجرم ہیں۔ کیوں کہ ہم نے اپنے خواب کھو جانے دیئے۔

الف: اور دوسروں کے خوابوں میں رخنہ اندازی کی۔

ب: تم کو یہ حق کس طرح پہنچتا تھا کہ تم دوسروں سے کہو، کہ اس طرح کے خواب دیکھو اس طرح کے نہیں۔

الف: اب میری مدد کے لئے کون آئے گا؟

ب: مجھے معلوم نہیں۔

الف: میں اور تم دونوں ایک دوسرے کے جاسوس ہیں۔ ہم دو سانپ ہیں، ہم دو بچھو ہیں، ہم دونوں دو قسم کے کتے ہیں۔ ایک کوکر اسپینل رومانٹک، اداس آنکھیں نیم وا کیئے صوفے پر بیٹھا ہے۔ دوسرا گلی کا کتا سڑک کے کنارے بھوک سے بلبلا رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وقت مقررہ پر ہڈیاں ایک کے آگے ڈال دی جاتی ہیں۔ دوسرا اسی طرح بلبلاتا رہتا ہے۔

ب: بیگم صاحبہ آپ کو ارتھا کٹ کی آواز پسند آئی ہے؟

الف: جھکڑ تیز ہو گیا ہے۔ اب تو کان پڑے آواز نہیں سنائی دیتی۔ عجیب عجیب شکلوں کے لوگ، جن کے منہ کالے ٹوپ میں چھپے ہیں اور مجھے اچھی طرح نظر نہیں آتے، بگولوں پر چڑیلوں کی طرح سوار چکر کاٹ رہے ہیں۔

ب: میں ان کو پہچانتا ہوں ــــ تمہیں بھی ان کو پہچاننا چاہیئے۔

الف: ہاں، میرے سامنے حسین فاطمی اور ہنگری والے اور اخوان المسلمین والے اور بے شمار چینی اور روسی اور جاپانی اور حبشی اور کورین اور ملایائی اور جانے کون کون ایک، قطار میں رسیوں سے لٹک رہے ہیں اور جھکڑ میں ان کی ٹانگیں ہل رہی ہیں۔

ب: حسین فاطمی بڑا وجیہہ نوجوان تھا۔

الف: ہاں۔ مجھے وہ نظر آرہا ہے۔ وہ تو مسکراتا ہے۔ مجھے اس کی مسکراہٹ سے ڈر لگ رہا ہے۔

ب: کیا ہنڈی والا بھی مسکرا رہا ہے؟

الف: ہاں۔ اور باقی سب، قہقہے لگا رہے ہیں۔ یہ لوگ مارے جانے پر اس قدر خوش کیوں ہیں؟

ب: یہ تم نہیں سمجھ سکتے۔ کیوں کہ انہوں نے اپنے خوابوں کو کھونے نہیں دیا۔

الف: میں جانتا ہوں۔ اب میں کسے بلاؤں گا جو مجھے ان ہولناک تصورات سے نجات دلائے گا؟......

عبدل ـــ عبدل ـــ عبدل ـــ

ب: ینگ جمی بھی ٹینس کورٹ سے واپس آگیا ہے۔

الف: ہائی ـــ جمی ـــ عبدل۔ صاحب کے لئے ایک ڈرائی مارٹینی

(پردہ)

پت جھڑ کی آواز

صبح میں گلی کے دروازے میں کھڑی سبزی والے سے گوبھی کی قیمت پر جھگڑ رہی تھی۔ اوپر باورچی خانے میں دال چاول اُبالنے کے لئے چڑھا دیئے تھے۔ ملازم سودا لینے کے لئے بازار جا چکا تھا۔ غسل خانے میں وقار صاحب چینی کی چلمچی کے اوپر لگے ہوئے مدھم آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہوئے گنگنا رہے تھے اور شیو کرتے جاتے تھے۔ میں سبزی والے سے بحث کرنے کے ساتھ ساتھ سوچنے میں مصروف تھی۔ کہ رات کے کھانے کے لئے کیا کیا تیار کیا جائے اتنے میں سامنے ایک کار آن کر رُکی۔ ایک لڑکی نے کھڑکی میں سے جھانکا اور پھر دروازہ کھول کر باہر اُتر آئی۔ میں پیسے گن رہی تھی۔ اس لئے میں نے اُسے نہ دیکھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھی اب میں نے سر اٹھا کر اس پر نظر ڈالی۔

"ارے ــــ تم ــــ!" اس نے ہکا بکا ہو کر کہا۔ اور وہیں ٹھٹھک کر رہ گئی۔ ایسا لگا جیسے وہ مدتوں سے مجھے مُردہ تصوّر کر چکی ہے، اور اب میرا بھوت اس کے سامنے کھڑا ہے۔

اس کی آنکھوں میں ایک لحظے کے لئے جو دہشت میں نے دیکھی اُس کی یاد نے مجھے باؤلا کر دیا ہے۔ میں تو سوچ سوچ کے دیوانی ہو جاؤں گی۔

یہ لڑکی (اس کا نام تک ذہن میں محفوظ نہیں اور اس وقت میں نے جھینپ کے مارے اس سے پوچھا بھی نہیں۔ ورنہ وہ کتنا بُرا مانتی) میرے ساتھ دِلّی کے کوئین میری

میں پڑھتی تھی۔ یہ بیس سال پہلے کی بات ہے۔ میں اس وقت کوئی سترہ سال کی رہی ہوں گی۔ مگر میری صحت اتنی اچھی تھی کہ اپنی عمر سے کہیں بڑی معلوم ہوتی تھی اور میری خوبصورتی کی دھوم مچنی شروع ہو چکی تھی۔ دلّی میں قاعدہ تھا کہ لڑکے والیاں اسکول اسکول گھوم کے لڑکیاں پسند کرتی پھرتی تھیں اور جو لڑکی پسند آتی تھی اس کے گھر "رقعہ" بھجوا دیا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں مجھے معلوم ہوا کہ اس لڑکی کی ماں، خالہ وغیرہ نے مجھے پسند کر لیا ہے (اسکول ڈے کے جلسے کے روز دیکھ کر) اور اب وہ مجھے بہو بنانے پر تلی بیٹھی ہیں۔ یہ لوگ نورجہاں روڈ پر رہتے تھے اور لڑکا حال ہی میں ریزرو بنک آف انڈیا میں دو ڈیڑھ سو روپے ماہوار کا نوکر ہوا تھا۔ چنانچہ "رقعہ" میرے گھر بھجوایا گیا۔ مگر میری اماں جان میرے لئے بڑے اونچے خواب دیکھ رہی تھیں۔ میرے والدین دلّی سے باہر میرٹھ میں رہتے تھے اور ابھی میرے بیاہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ پیغام فی الفور نامنظور کر دیا گیا۔

اس کے بعد اس لڑکی نے کچھ عرصے میرے ساتھ کالج میں بھی پڑھا۔ پھر اس کی شادی ہو گئی اور وہ کالج چھوڑ کر چلی گئی۔ آج اتنے عرصے بعد لاہور کی مال روڈ کے پچھواڑے اس گلی میں میری اس سے مڈبھیڑ ہوئی۔ میں نے اس سے کہا۔ اوپر آؤ۔ چائے وائے پیو۔ پھر اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ لیکن اس نے کہا میں جلدی میں کسی سسرالی رشتے دار کا مکان تلاش کرتی ہوئی اس گلی میں آ نکلی تھی۔ انشاءاللہ پھر کبھی ضرور آؤں گی۔ اس کے بعد وہیں کھڑے کھڑے اس نے جلدی جلدی نام بنام ساری پرانی دوستوں کے قصے سنائے۔ کون کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ سلیمہ بریگیڈیر فلاں کی بیوی ہے۔ چار بچے ہیں۔ فرخندہ کا میاں فارن سروس میں ہے۔ اس کی بڑی لڑکی لندن میں پڑھ رہی ہے۔ ریحانہ فلاں کالج میں پرنسپل ہے۔ سعدیہ امریکہ سے ڈھیروں ڈگریاں لے آئی ہے اور کراچی میں کسی اونچی ملازمت پر براجمان ہے۔ کالج کی ہندو ساتھیوں کے حالات سے بھی وہ باخبر تھی۔ پربھا کا میاں انڈین نیوی میں کموڈور ہے۔ وہ بمبئی میں رہتی ہے۔ سرلا آل انڈیا ریڈیو میں اسٹیشن ڈائرکٹر ہے۔

اور جنوبی ہند میں کہیں تعینات ہے۔ لوتیکا بڑی مشہور آرٹسٹ بن چکی ہے اور نئی دلّی میں اس کا اسٹوڈیو ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ یہ سب باتیں کر رہی تھی مگر اس کی آنکھوں کی اس دہشت کو میں نہ بھول سکی۔

اس نے کہا۔ "میں سعدیہ ریحانہ وغیرہ جب بھی کراچی میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ تمہیں برابر یاد کرتے ہیں۔"

"واقعی ——؟" میں نے کھوکھلی ہنسی ہنس کر پوچھا۔ مجھے معلوم تھا مجھے کن الفاظ میں یاد کیا جاتا ہوگا: چپل پائیاں، ارے کیا یہ لوگ میری سہیلیاں تھیں؟ عورتیں دراصل ایک دوسرے کے حق میں چڑیلیں ہوتی ہیں۔ کٹنیاں، خرافاتیں، اس نے مجھ سے یہ بھی نہیں دریافت کیا کہ میں یہاں نیم تاریک سنسان گلی میں اس کھنڈر ایسے مکان کے شکستہ زینے پر کیا کر رہی ہوں۔ اسے معلوم تھا۔

عورتوں کی انٹیلیجنس سروس اتنی زبردست ہوتی ہے کہ انٹرپول بھی اس کے آگے پانی بھرے اور پھر میرا قصہ تو الم نشرح ہے۔ میری حیثیت کوئی قابلِ ذکر نہیں۔ گمنام ہستی ہوں۔ اس لئے کسی کو میری پروا نہیں۔ خود مجھے بھی اپنی پروا نہیں۔

میں تنویر فاطمہ ہوں۔ میرے ابا میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ معمولی حیثیت کے زمیندار تھے۔ ہمارے یہاں بڑا سخت پردہ کیا جاتا تھا۔ خود میرا میرے چچازاد، پھوپھی زاد بھائیوں سے پردہ تھا۔ میں بے انتہا لاڈوں کی پلی جہیتی لڑکی تھی۔ جب میں نے اسکول میں بہت سے وظیفے حاصل کر لئے تو میٹرک کرنے کے لئے خاص طور پر میرا داخلہ کوئین میری اسکول میں کرایا گیا۔ انٹر کے لئے میں علی گڑھ بھیج دی گئی۔ علی گڑھ گرلز کالج کا زمانہ میری زندگی کا بہترین دور تھا کیسا خواب آگیں دور تھا۔ میں جذبات پرست نہیں لیکن اب بھی جب کالج کا صحن، روشیں، گھاس کے اونچے پودے، درختوں پر جھکی بارش، نمائش کے میدان میں گھومتے ہوئے کالے برقعوں کے پرے، ہوسٹل کے تیلے تیلے برآمدوں چھوٹے چھوٹے کمروں کی وہ شدید گھریلو فضائیں یاد آتی ہیں تو جی ڈوب سا

جاتا ہے۔ ایم۔ ایس۔ سی کے لئے میں پھر دلّی آ گئی۔ یہاں کالج میں میرے ساتھ یہی سب لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ ریحانہ، سعدیہ، پربھا، فلانی ڈھماکی، مجھے لڑکیاں کبھی پسند نہ آئیں مجھے دنیا میں زیادہ تر لوگ پسند نہیں آئے۔ بیشتر لوگ محض تضیع اوقات ہیں۔ میں بہت مغرور تھی۔ حسن ایسی چیز ہے کہ انسان کا دماغ خراب ہوتے دیر نہیں لگتی۔ پھر میں تو بقول شخصے لاکھوں میں ایک تھی۔ شیشے کا ایسا جھلکتا ہوا رنگ سرخی مائل سنہرے بال بے حد شاندار ڈیل ڈول۔ بنارسی ساڑھی پہن لوں تو بالکل کہیں کی مہارانی معلوم ہوتی تھی۔

یہ جنگ کا زمانہ تھا۔ یا شاید جنگ اسی سال ختم ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ بہر حال دلّی پہ بہار آئی ہوئی تھی ——— کروڑ پتی کاروباریوں اور حکومت ہند کے اعلیٰ افسروں کی لڑکیاں ——— ہندو، سکھ، مسلمان ——— لمبی لمبی موٹروں میں اڑی اڑی پھرتیں نت نئی پارٹیاں، جلسے، ہنگامے۔ آج اندرپرستھ کالج میں ڈرامہ ہے کل میرانڈا ہاؤس میں۔ پرسوں لیڈی اردن کالج میں کونسرٹ ہے۔ لیڈی ہارڈنگ اور سینٹ اسٹیونز کالج ——— چیمسفرڈ کلب، روشن آرا، امپیریل جم خانہ۔ غرض کہ ہر طرف الف لیلےٰ کے باب بکھرے پڑے تھے۔ ہر جگہ نوجوان فوجی افسروں اور سول سروس کے بن بیاہے عہدے داروں کے پرے ڈولتے نظر آتے۔ ایک ہنگامہ تھا ———

پربھا اور سرلا کے ہمراہ ایک روز میں دلجیت کور کے یہاں جو ایک کروڑ پتی سکھ کنٹریکٹر کی لڑکی تھی۔ کنگ ایڈورڈ روڈ کی ایک شاندار کوٹھی میں گارڈن پارٹی کے لئے مدعو تھی۔

یہاں میری ملاقات میجر خوشوقت سنگھ سے ہوئی۔ یہ جھالسی کی طرف کا چوہان راجپوت تھا۔ لمبا تڑنگا کالا بھجنگ، لانبی لانبی اور پر کو مڑی ہوئی نوکیلی مونچھیں، بے حد چمکیلے اور خوبصورت دانت، ہنستا تو بہت اچھا لگتا۔ غالب کا پرستار تھا، بات بات پر شعر پڑھتا۔ قہقہے لگاتا اور جھک جھک کر بے حد اخلاق سے سب سے باتیں کرتا۔ اس نے ہم کو دوسرے روز سینما

چلنے کی دعوت دی۔ سرلا، پربھا وغیرہ ایک بد دماغ لڑکیاں تھیں اور خاصی قدامت پسند وہ لڑکوں کے ساتھ باہر گھومنے بالکل نہیں جاتی تھیں۔ خوش وقت سنگھ دلجیت کے بھائی کا دوست تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا جواب دوں کہ اتنے میں سرلا نے چپکے سے کہا۔" خوش وقت کے ساتھ ہرگز سینما مت جانا۔ سخت لوفر لڑکا ہے۔" میں چپ ہو گئی۔

اس زمانے میں نئی دلی کی دو ایک آوارہ لڑکیوں کے قصّے بہت مشہور ہو رہے تھے۔ اور میں سوچ سوچ کر ڈرا کرتی تھی۔ شریف گھرانوں کی لڑکیاں اپنے ماں باپ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کس طرح لوگوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہیں۔ ہوسٹل میں ہم اکثر اس قسم کی لڑکیوں کے لئے قیاس آرائی کیا کرتے تھے۔ یہ بڑی عجیب اور پر اسرار ہستیاں معلوم ہوتیں۔ حالانکہ دیکھنے میں وہ بھی ہماری طرح ہی کی لڑکیاں تھیں۔ ساڑھیوں اور شلواروں میں ملبوس۔ طرحدار، خوبصورت، پڑھی لکھی ——

" لوگ بدنام کر دیتے ہیں جی ——" سعدیہ دماغ پر بہت زور ڈال کر کہتی —— " اب ایسا بھی کیا ہے۔"

" دراصل ہماری سوسائٹی اس قابل ہی نہیں ہوئی کہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ہضم کر سکے۔" سرلا کہتی۔

" ہوتا یہ ہے کہ لڑکیاں احساس توازن کھو بیٹھتی ہیں۔" ریحانہ رائے دیتی۔

بہرحال کسی طرح یقین نہ آتا کہ یہ ہماری جیسی، ہمارے ساتھ کی چند لڑکیاں ایسی ایسی خوف ناک حرکتیں کس طرح کرتی ہیں۔

دوسری شام میں لیبارٹری کی طرف جا رہی تھی کہ نکلسن میموریل کے قریب ایک قرمزی رنگ کی لمبی سی کار آہستہ سے رُک گئی۔ اس میں سے خوش وقت سنگھ نے جھانکا اور اندھیرے میں اس کے خوب صورت دانت جھلملائے۔

" اجی حضرت۔ یوں کہئیے کہ آپ اپنا اپوائنٹمنٹ بھول گئیں ——"

"جی ــــ ؟" میں نے ہڑبڑا کر کہا۔

"حضور والا ــــ چلیے میرے ساتھ فوراً۔ یہ شام کا وقت لیبارٹری میں گھس کر بیٹھنے کا نہیں ہے۔ اتنا پڑھ کر کیا کیجئے گا ؟"

میں نے بالکل غیر ارادی طور پر چاروں طرف دیکھا اور کار میں دبک کر بیٹھ گئی ــــ

ہم نے کناٹ پلیس جا کر ایک انگریزی فلم دیکھا۔

اس کے اگلے روز بھی۔

اس کے بعد ایک ہفتے تک میں نے خوب خوب سیرس اس کے ساتھ کیں۔ وہ میڈنز میں ٹھہرا ہوا تھا۔

اس ہفتے کے آخر تک میں میجر خوش وقت سنگھ کی مسٹریس بن چکی تھی۔

میں لٹریری نہیں ہوں، میں نے چینی، جاپانی، روسی، انگریزی یا اردو شاعری کا مطالعہ نہیں کیا۔ ادب پڑھنا میرے نزدیک وقت ضائع کرنا ہے۔ پندرہ برس کی عمر سے سائنس میرا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ مابعد الطبیعاتی تصورات کیا ہوتے ہیں۔ MYSTIC کشش کے کیا معنی ہیں۔ شاعری اور فلسفے کے لئے نہ میرے پاس فرصت جب تھی نہ اب ہے۔ میں بڑے بڑے مبہم، غیر واضح اور پُراسرار الفاظ بھی استعمال نہیں کر سکتی۔

بہر حال پندرہ روز کے اندر اندر یہ واقعہ بھی کم و بیش کالج میں سب کو معلوم ہو چکا تھا۔ لیکن مجھ میں اپنے اندر ہمیشہ سے بڑی عجیب سی خود اعتمادی تھی۔ میں نے اب پروا نہیں کی۔ پہلے بھی میں لوگوں سے بول چال بہت کم رکھتی تھی۔ سرلا وغیرہ کا گروہ اب مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا گویا میں مریخ سے اُتر کر آئی ہوں یا میرے سر پر سینگ ہیں۔ ڈائننگ ہال میں میرے باہر جانے کے بعد گھنٹوں میرے قصّے دہرائے جاتے۔ اپنی انٹیلیجنس سروس کے ذریعے میرے اور خوشوقت کے بارے میں ان کو بیل پل کی خبر رہتی۔ ہم لوگ شام کو کہاں گئے ــــ رات نئی دلّی کے کون سے ہال روم میں ناچے

(خوشوقت معرکے کا ڈانسر تھا۔ اس نے مجھے ناچنا بھی سکھا دیا تھا) خوشوقت نے مجھے کیا کیا تحائف کون کون سی دوکانوں سے خرید کے دیئے۔

خوشوقت بنگھ مجھے مارتا بہت تھا اور مجھ سے اتنی محبت کرتا تھا جو آج تک دنیا میں کسی مرد نے کسی عورت سے نہ کی ہوگی۔

کئی مہینے گذر گئے۔ میرے ایم۔ ایس۔ سی پریویس کے امتحان سر پہ آ گئے اور میں پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ امتحانات کے بعد اس نے کہا۔" جانِ من۔ دلربا! چلو کسی خاموش سے پہاڑ پہ چلیں۔ سولن۔ ڈلہوزی لینسڈاؤن ـــــ میں چند روز کے لئے میرٹھ گئی اور ابا سے یہ کہہ کر (اماں جان کا جب میں تھرڈ ایئر میں تھی تو انتقال ہو گیا تھا) دلّی واپس آ گئی کہ فائنل ایئر کے لئے بے حد پڑھائی کرنی ہے۔ شمالی ہند کے پہاڑی مقامات پہ بہت سے شناساؤں کے ملنے کا امکان تھا اس لئے ہم دور جنوب میں اوٹی چلے گئے وہاں مہینہ بھر رہے۔ خوشوقت کی چھٹی ختم ہوگئی تو دلّی واپس آ کر تیمار پور کے ایک بنگلے میں ٹک گئے۔

کالج کھلنے سے ایک ہفتہ قبل خوشوقت کی اور میری بڑی زبردست لڑائی ہوئی۔ اس نے مجھے خوب مارا۔ اتنا مارا کہ میرا سارا چہرہ لہولہان ہوگیا اور میری باہوں اور پنڈلیوں پر نیل پڑ گئے۔ لڑائی کی وجہ اس کی وہ مردار عیسائی منگیتر تھی جو جانے کہاں سے ٹپک پڑی تھی اور سارے میں میرے خلاف زہر اگلتی پھر رہی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو مجھے کچا چبا جاتی۔ یہ چار سو بیس لڑکی جنگ کے زمانے میں فوج میں تھی اور خوشوقت کو برما کے محاذ پہ ملی تھی۔ خوشوقت نے جانے کس طرح اس سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ لیکن مجھ سے ملنے کے بعد اب وہ اس کی انگوٹھی واپس کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔

اس رات تیمار پور کے اس سنسان بنگلے میں اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑے اور رو رو کر مجھ سے کہا کہ میں اس سے بیاہ کر لوں، ورنہ وہ مر جائے گا۔ میں نے کہا ہرگز نہیں۔ قیامت تک نہیں۔ میں اعلےٰ خاندان سید زادی، بھلا اس کالے تمباکو کے پنڈے

ہندو جاٹ سے بیاہ کر کے خاندان کے ماتھے پہ کلینک کا ٹیکہ لگاتی۔ میں تو اس حسین و جمیل کسی بہت اُونچے مسلمان گھرانے کے چشم و چراغ کے خواب دیکھ رہی تھی جو ایک روز دیر یا سویر، بارات لے کر مجھے بیاہنے آئے گا۔ ہمارا آرسی مصحف ہوگا۔ سہرے جلوے سے رخصت ہو کر اس کے گھر جاؤں گی۔ بجلی بسنت نندیں دروازے پہ دہلز روک کر اپنے بھائی سے نیگ کے لئے جھگڑیں گی۔ میرا تنیس ڈھولک لئے کھڑی ہوں گی۔ کیا کیا کچھ ہوگا۔ میں نے کیا ہندو مسلم شادیوں کا حشر دیکھا نہیں تھا۔ کیتوں نے ترقی پسندی یا جذبۂ عشق کے جوش میں آکر ہندوؤں سے بیاہ رچائے اور سال بھر کے اندر جوتیوں میں دال بٹی۔ بچوں کا جو حشر خراب ہوا وہ الگ۔ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ میرے انکار پر خوشوقت نے جوتے لات سے مار مار کر میرا بھرکس نکال دیا اور تیسرے دن اس ڈائن کالی بلا کیتھرین دھرم داس کے ساتھ آگرے چلا گیا جہاں اس نے اس بدذات لڑکی سے سول میرج کر لی۔

جب میں نئی ٹرم کے آغاز پر ہوسٹل پہنچی تو اس حلیے سے کہ میرے سر اور چہرے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ آپا کو میں نے لکھ بھیجا کہ لیبارٹری میں ایک تجربہ کر رہی تھی۔ ایک خطرناک مادّہ بھک سے اڑا اور اس سے میرا منہ تھوڑا سا جل گیا۔ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ فکر نہ کیجئے۔

لڑکیوں کو تو سارا قصّہ پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اخلاقاً میری خیریت بھی نہ پوچھی۔ اتنے بڑے اسکینڈل کے بعد مجھے ہوسٹل میں رہنے کی اجازت نہ دی جاتی۔ مگر ہوسٹل کی وارڈن خوشوقت سنگھ کی بہت دوست تھی۔ اس لئے سب خاموش رہے۔ اس کے علاوہ کسی کے پاس کسی طرح کا ثبوت بھی نہ تھا۔ کالج کی لڑکیوں کو لوگ یوں بھی خواہ مخواہ بدنام کرنے پہ تلے رہتے ہیں۔

مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے۔ جیسے کل کی بات ہو۔ صبح کے دس گیارہ بجے ہوں گے۔ ریلوے اسٹیشن سے لڑکیوں کے تانگے آآ کر پھاٹک میں داخل ہو رہے تھے ہوسٹل کے لان پر برگد کے درخت کے نیچے لڑکیاں اپنا اپنا اسباب اتروا کر رکھوا

رہی تھیں۔ بڑی سخت چل پوں مچا رکھی تھی۔ جس وقت میں اپنے تانگے سے اتری وہ میرا ڈھاٹے سے بندھا ہوا سفید چہرہ دیکھ کر ایسی حیرت زدہ ہوئیں جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ میں نے سامان چوکیدار کے سر پر رکھوایا اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ دوپہر کو جب میں کھانے کی میز پر آن کر بیٹھی تو ان قطّاماؤں نے مجھ سے اس اخلاق سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں جن سے اچھی طرح یہ ظاہر ہو جائے کہ میرے حادثے کی اصل وجہ جانتی ہیں اور مجھے ندامت سے بچانے کے لئے اس کا تذکرہ ہی نہیں کر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک نے جو اس چنڈال چوکڑی کی گرو اور ان سب کی استاد تھی۔ رات کو کھانے کی میز پر فیصلہ صادر کیا کہ میں نفسیات کی اصطلاح میں (NYMPHO MANIAC) ہوں۔ (مجھے میری جاسوسوں کے ذریعے یہ اطلاع فوراً اوپر پہنچ گئی جہاں میں اس وقت اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس ٹیبل لیمپ لگائے پڑھائی میں مصروف تھی) اور اس طرح کی باتیں نواب عام تھیں کہ ایک مچھلی سارے جل کو گندا کرتی ہے۔ اسی لئے تو لڑکیوں کی بے پردگی آزادی خطرناک اور اعلیٰ تعلیم بدنام ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں اپنی حد تک سو فیصدی ان آرا سے متفق تھی۔ میں خود سوچتی تھی کہ بعض اچھی خاصی بھلی چنگی اعلےٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں آوارہ کیوں ہو جاتی ہیں۔ ایک تھیوری تھی کہ وہی لڑکیاں آوارہ ہوتی ہیں جن کا "آئی۔ کیو" بہت کم ہوتا ہے۔ ذہین انسان کبھی اپنی تباہی کی طرف جان بوجھ کر قدم نہ اُٹھائے گا۔ مگر میں نے تو اچھی خاصی سمجھدار تیز و طرار لڑکیوں کو بوفری کرتے دیکھا تھا۔ دوسری تھیوری تھی کہ سیر و تفریح روپے پیسے، عیش و آسائش کی زندگی قیمتی تحائف کا لالچ، رومان کی تلاش، ایڈونچر کی خواہش، یا محض اکتاہٹ، پابردے کی قید و بند کے بعد آزادی کی فضا میں داخل ہو کر پرانی اقدار سے بغاوت۔ اس صورت حال کی چند وجوہ ہیں۔ یہ سب باتیں ضرور ہوں گی۔ ورنہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

میں فرسٹ ٹرمنل امتحان سے فارغ ہوئی تھی کہ خوشوقت پھر آن پہنچا۔ اس نے

مجھے لیبارٹری فون کیا کہ میں نرولا میں چھ بجے اس سے ملوں۔ میں نے ایسا ہی کیا ـــــ وہ کیتھرین کو اپنے ماں باپ کے یہاں چھوڑ کر سرکاری کام سے دلّی آیا تھا۔ اس مرتبہ، ہم ہوائی جہاز سے ایک ہفتے کے لئے بمبئی چلے گئے۔

اس کے بعد اس سے ہر دوسرے تیسرے مہینے ملنا ہوتا رہا۔ ایک سال نکل گیا۔ اب کے سے جب وہ دلّی آیا تو اس نے اپنے ایک جگری دوست کو مجھے لینے کے لئے موٹر لے کر بھیجا۔ کیونکہ وہ لکھنؤ سے لاہور جاتے ہوئے پالم پہ چند گھنٹے کے لئے ٹھہرا تھا۔ یہ دوست دلّی کے ایک بڑے مسلمان تاجر کا لڑکا تھا۔ لڑکا تو خیر نہیں کہنا چاہیئے۔ اس وقت بھی وہ چالیس کے پیٹے میں رہا ہوگا۔ بیوی بچوں والا۔ تاڑ کا سا قد۔ بے حد غلط انگریزی بولتا تھا۔ کالا۔ بدقطع۔ بالکل چڑی مار کی شکل۔ ہوش صفت۔

خوشوقت اب کی مرتبہ دلّی سے گیا تو پھر کبھی واپس نہ آیا۔ کیونکہ اب میں فاروق کی مسٹریس بن چکی تھی۔

فاروق کے ساتھ اب میں اس کی "منگیتر" کی حیثیت سے باقاعدہ دلّی کی اونچی سوسائٹی میں شامل ہوگئی۔ مسلمانوں میں تو چار شادیاں جائز ہیں۔ لہذا یہ کوئی بہت بڑی بات نہ تھی۔ یعنی مذہب کے نقطۂ نگاہ سے۔ کہ وہ اپنی اَن پڑھ، ادھیڑ عمر کی پردے کی بُو بُو کی موجودگی میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو چار آدمیوں میں ڈھنگ سے اُٹھ بیٹھ سکے اور پھر دولت مند طبقے میں سب کچھ جائز ہے۔ یہ تو ہماری مڈل کلاس کے قوانین ہیں کہ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، طویل چھٹیوں کے زمانے میں فاروق نے بھی مجھے خوب سیریں کرائیں۔ کلکتہ، لکھنؤ، اجمیر کون جگہ تھی جو میں نے اس کے ساتھ نہ دیکھی۔ اس نے مجھے ہیرے، جواہرات کے گہنوں سے لاد دیا۔ ابّا کو لکھ بھیجتی تھی کہ یونیورسٹی کے طالب علموں کے ہمراہ ٹور پہ جا رہی ہوں۔ یا فلاں جگہ ایک سائنس کانفرنس میں شرکت کے لئے مجھے بلایا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے اپنا تعلیمی ریکارڈ اونچا رکھنے کی دھن تھی۔ فائنل امتحان میں مَیں نے بہت ہی خراب پرچے کئے اور امتحان ختم ہوتے ہی گھر چلی گئی۔

اسی زمانے میں دلّی میں گڑبڑ شروع ہوئی اور فسادات کا بھونچال آگیا۔ فاروق نے مجھے میرٹھ خط لکھا کہ تم فوراً پاکستان چلی جاؤ۔ میں تم سے وہیں ملوں گا۔ میرا پہلے ہی سے یہ ارادہ تھا۔ ابّا بھی بے حد پریشان تھے اور یہی چاہتے تھے کہ ان حالات میں اب میں انڈیا میں نہ رہوں۔ جہاں شریف مسلمان لڑکیوں کی عزتیں مستقل خطرے میں ہیں۔ پاکستان اپنا اسلامی ملک تھا۔ اس کی بات ہی کیا تھی۔ ابّا جائداد وغیرہ کی وجہ سے فی الحال ترک وطن نہ کر سکتے تھے۔ میرے بھائی دونوں بہت چھوٹے چھوٹے تھے اور اماں جان کے انتقال کے بعد ابّا نے ان کو میری خالہ کے پاس حیدرآباد دکن بھیج دیا تھا۔ میرا رزلٹ نکل چکا تھا۔ اور میں تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئی تھی۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ جب بلووں کا زور ذرا کم ہوا تو میں ہوائی جہاز سے لاہور آگئی۔ فاروق میرے ساتھ آیا۔ اس نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ اپنے کاروبار کی ایک شاخ پاکستان میں قائم کر کے لاہور اس کا ہیڈ آفس رکھے گا۔ مجھے اس کا مالک بنائے گا اور وہیں مجھ سے شادی کر لے گا۔ وہ دلّی سے ہجرت نہیں کر رہا تھا۔ کیونکہ اس کے باپ بڑے احراری خیالات کے آدمی تھے۔ پلان یہ تھا کہ وہ ہر دوسرے تیسرے مہینے دلّی سے لاہور آتا رہے گا۔ لاہور میں افراتفری تھی۔ حالانکہ ایک سے ایک اعلیٰ کوٹھی الاٹ ہو سکتی تھی، مگر فاروق یہاں کسی کو جانتا نہ تھا۔ بہر حال، سنت نگر میں ایک چھوٹا سا مکان میرے نام الاٹ کرا کے اس نے مجھے وہاں چھوڑ دیا۔ اور میری دوسرا ہتھ کے لئے اپنے ایک دور کے رشتے دار کنبے کو میرے پاس ٹھہرا دیا۔ جو مہاجر ہو کے لاہور آئے تھے اور مارے مارے پھر رہے تھے۔

میں زندگی کی اس یک بیک تبدیلی سے اتنی ہکا بکا تھی کہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ کہاں غیر منقسم ہندوستان کی وہ بھرپور، دلچسپ رنگا رنگ دنیا کہاں ۱۹۴۸ء کے لاہور کا وہ تنگ و تاریک مکان۔ غریب الوطنی۔ اللہ اکبر۔ میں نے کیسے کیسے دل ہلا دینے والے زمانے دیکھے ہیں۔

میں اتنی خالی الذہن ہو چکی تھی کہ میں نے تلاش ملازمت کی بھی کوئی کوشش نہ کی۔ روپے کی طرف سے فکر نہ تھی۔ کیونکہ فاروق میرے نام دس ہزار روپیہ جمع کرا گیا تھا۔

(صرف دس ہزار۔ وہ خود کروڑوں کا آدمی تھا۔ مگر اس وقت میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ اب بھی نہیں آتا)

دن گزرتے گئے۔ میں صبح سے شام تک پلنگ پر پڑی فاروق کی رشتے کی خالہ یا نانی جو کچھ بھی وہ بڑی بی تھیں۔ ان سے ان کی ہجرت کے مصائب کی داستان اور ان کی سابقہ امارت کے قصے سنا کرتی اور پان پہ پان کھاتی، یا ان کی میٹرک کی طالب علم بیٹی کو الجبرا جیومیٹری سکھلایا کرتی۔ ان کا بیٹا فاروق کی برائے نام بزنس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔

فاروق سال میں پانچ چھ چکر لگا لیتا۔ اب لاہور کی زندگی رفتہ رفتہ نارمل ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آمد سے میرے دن کچھ رونق کے کٹتے۔ اس کی خالہ بڑے اہتمام سے دلّی کے کھانے اس کے لئے تیار کرتیں۔ میں مال کے ہیئر ڈریسر کے یہاں جا کر اپنے بال سیٹ کروا آتی۔ شام کو ہم دونوں جم خانہ کلب چلے جاتے اور وہاں ایک کونے کی میز پر بیئر کا گلاس سامنے رکھے فاروق مجھے دلّی کے واقعات سناتا۔ وہ بے تکان بولے چلا جاتا یا پھر دفعتاً چپ ہو کر کمرے میں آنے والی اجنبی صورتوں کو دیکھتا رہتا۔ اس نے شادی کا کبھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ میں نے بھی اس سے نہیں کہا۔ میں اب اکتا چکی تھی۔ کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا جب وہ دلّی واپس چلا جاتا تو میں ہر پندرہویں دن اپنی خیریت کا خط اور اس کے کاروبار کا سال لکھ بھیجتی اور لکھ دیتی کہ اب کی دفعہ آئے تو کنٹ پلیس یا چاندنی چوک کی فلاں دوکان سے فلاں فلاں قسم کی ساڑھیاں لیتا آئے۔ کیونکہ پاکستان میں اچھی ساڑھیاں ناپید ہیں۔

ایک روز میرٹھ سے چچا میاں کا خط آیا کہ ابّا کا انتقال ہو گیا ہے۔

جب احمدِ مرسل نہ رہے کون رہے گا

میں جذبات سے واقف نہیں ہوں۔ مگر باپ مجھ پہ جان چھڑکتے تھے۔ ان کی موت کا مجھے سخت صدمہ ہوا۔ فاروق نے مجھے بڑے پیار کے دلاسے بھرے خط لکھے۔ تو ذرا دھارس بندھی۔ اُس نے لکھا: نماز پڑھا کرو۔ بہت بُرا وقت ہے۔ دنیا پر کالی آندھی چل رہی

ہے۔ سورج ڈیڑھ بلّم پہ آیا چاہتا ہے۔ پل کا بھروسہ نہیں۔ سارے کاروباریوں کی طرح وہ بھی بڑا سخت مذہبی اور توہم پرست آدمی تھا۔ پابندی سے اجمیر شریف جاتا۔ نجومیوں، رمالوں، پنڈتوں، سیانوں، پیروں، فقیروں، اچھے اور برے شگونوں، خوابوں کی تعبیر، غرض کہ ہر چیز کا قائل تھا۔ ایک مہینہ میں نے نماز بھی پڑھی۔ مگر جب میں سجدے میں جاتی تو دل چاہتا خوب زور زور سے ہنسوں۔

ملک میں سائنس کی خواتین لیکچراروں کی بڑی زبردست مانگ تھی۔ جب مجھے ایک مقامی کالج والوں نے بے حد مجبور کیا تو میں نے پڑھانا شروع کر دیا۔ حالانکہ لیکچری کرنے سے مجھے سخت نفرت ہے۔ کچھ عرصے بعد مجھے پنجاب کے ایک دور افتادہ ضلع کے گرلز کالج میں بلا لیا گیا۔ کئی سال تک میں نے وہاں کام کیا۔ مجھ سے میری طالب علم لڑکیاں اکثر پوچھتیں۔ "ہائے اللہ مس تنویر۔ آپ اتنی پیاری سی ہیں۔ آپ اپنے کروڑپتی منگیتر سے شادی کیوں نہیں کرتیں؟"

اس سوال کا خود میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

یہ نیا ملک تھا۔ نئے لوگ۔ نیا معاشرہ۔ یہاں کسی کو میرے ماضی کا علم نہ تھا۔ کوئی بھی بھلا مانس مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو سکتا تھا۔ (لیکن بھلے مانس، خوش شکل سیدھے سادے شریف زادے مجھے پسند ہی نہیں آتے تھے۔ میں کیا کرتی) دلّی کے قصّے دلّی میں رہ گئے اور پھر میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ ایک سے ایک حرّافہ لڑکیاں اب ایسی پارسا بنی ہوئی ہیں کہ دیکھا ہی کیجئے۔ خود ایڈتھ ہری رام اور رانی خان کی مثال میرے سامنے موجود ہے۔

اب فاروق بھی کبھی کبھی آتا۔ ہم لوگ اس طرح ملتے گویا بیسوں برس کے پرانے شادی شدہ میاں بیوی ہیں جن کے پاس سارے نئے موضوع ختم ہو چکے ہیں۔ اب سکون اور آرام اور ٹھہراؤ کا وقت ہے۔ فاروق کی بیٹی کی حال ہی میں دلّی میں شادی ہوئی ہے۔ اس کا لڑکا اوکسفرڈ جا چکا ہے۔ بیوی کو مستقل دمہ رہتا ہے۔ فاروق نے اپنے کاروبار کی شاخیں باہر کے کئی ملکوں میں پھیلا دی ہیں۔ نینی تال میں نیا بنگلہ بنوا

رہا ہے۔ فاروق اپنے خاندان کے قصے، کاروبار کے معاملات مجھے تفصیل سے سنایا کرتا اور میں اس کے لئے پان بناتی رہتی۔

ایک مرتبہ میں چھٹیوں میں کالج سے لاہور آئی تو فاروق کے ایک پرانے دوست سید وقار حسین خان سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ بھی اپنے وقت کے اکیلے تھے اور کچھ کم کم رُونہ تھے۔ دراز قد، موٹے تازے، سیاہ توا ایسا رنگ، عمر میں پینتالیس کے لگ بھگ۔ اچھے خاصے دیوزاد معلوم ہوتے۔ ان کو میں نے پہلی مرتبہ نئی دہلی میں دیکھا تھا۔ جہاں ان کا ڈانسنگ اسکول تھا۔ یہ رام پور کے ایک شریف گھرانے کے اکلوتے فرزند تھے۔ بچپن میں گھر سے بھاگ گئے۔ سرکس، کارنیوال اور تھیٹر کمپنیوں کے ساتھ ملکوں ملکوں گھومے سنگاپور، ہانگ کانگ، شنگھائی، لندن، جانے کہاں، کہاں۔ ان گنت قومیتوں اور نسلوں کی عورتوں سے وقتاً فوقتاً شادیاں رچائیں۔ ان کی موجودہ بیوی اُڑیسہ کے ایک مارواڑی مہاجن کی لڑکی تھی جس کو یہ کلکتے سے اڑا لائے تھے۔ بارہ پندرہ سال قبل میں نے اسے دلی میں دیکھا تھا۔ سانولی سلونی سی پستہ قد لڑکی تھی۔ اس کی شکل پر عجیب طرح کا الم برستا۔ مگر سُنا تھا کہ بڑی تیز طرار عورت تھی۔ میاں کی بدسلوکیوں سے تنگ آ کر اِدھر اُدھر بھاگ جاتی لیکن چند روز کے بعد پھر واپس موجود۔ خان صاحب نے کناٹ سرکس کی ایک بلڈنگ کی تیسری منزل میں انگریزی ناچ سکھانے کا اسکول کھول رکھا تھا۔ جس میں وہ اور ان کی بیوی اور دو اینگلو انڈین لڑکیاں گویا اسٹاف میں شامل تھیں۔ جنگ کے زمانے میں اس اسکول پر ہُن برسا۔ اتوار کے روز ان کے یہاں صبح کو "جیم سیشن" ہوا کرتے ایک مرتبہ میں بھی خوشوقت کے ساتھ وہاں گئی تھی۔ سُنا تھا کہ وقار صاحب کی بیوی ایسی مہاستی انسویا کی اوتار ہیں کہ ان کے میاں حکم دیتے ہیں کہ فلاں فلاں لڑکی سے بہناپا گانٹھو اور پھر اسے مجھ سے ملانے کے لئے لے کر آؤ۔ اور وہ نیک بخت ایسا ہی کرتی۔ ایک بار وہ ہمارے ہوسٹل بھی آئی اور چند لڑکیوں کے سر ہوئی کہ اس کے ساتھ بارہ کھمبا روڈ چل کر چائے پئیں۔

تقسیم کے بعد وقار صاحب بقول شخصے لُٹ لُٹا کر لاہور آن پہنچے تھے اور مال روڈ

کنٹ بچھواڑے ایک فلیٹ الاٹ کروا کے اس میں اپنا اسکول کھول لیا تھا۔ شروع شروع میں کاروبار مندا رہا۔ دلوں پر مردنی چھائی تھی۔ ناچنے گانے کا کسے ہوش تھا، اس فلیٹ میں تقسیم سے پہلے آریہ سماجی ہندوؤں کا میوزک اسکول تھا۔ لکڑی کے فرش کا ہال۔ پہلو میں دو چھوٹے کمرے، غسل خانہ اور باورچی خانہ، سامنے لکڑی کی بالکنی اور شکستہ ہلتا ہوا زینہ۔ "ہند ماتا سنگیت مہاودیالہ" کا بورڈ بالکنی کے جنگلے پر اب تک ٹیڑھا ٹنگا ہوا تھا۔ اسے اتار کر "وقار رزا اسکول آف بال روم اینڈ ٹیپ ڈانسنگ" کا بورڈ لگا دیا گیا۔ امریکی فلمی رسالوں سے تراش کر جین کیلی، فریڈ اسٹر، فرینک سیناٹرا، ڈورس ڈے وغیرہ کی رنگین تصویریں ہال کی بوسیدہ دیواروں پر آویزاں کر دی گئیں اور اسکول چالو ہو گیا۔ ریکارڈوں کا تھوڑا سا ذخیرہ خان صاحب دلی سے ساتھ لیتے آئے تھے۔ گراموفون اور سیکنڈ ہینڈ فرنیچر فاروق سے روپیہ قرض لے کر انہوں نے یہاں خرید لیا۔ کالج کے منچلے لونڈوں اور نئی دولت مند سوسائٹی کی تازہ تازہ فیشن ایبل بیگمات کو خدا سلامت رکھے۔ دو تین سال میں ان کا کام خوب چمک گیا۔

فاروق کی دوستی کی وجہ سے میرا اور ان کا کچھ بھاوج اور جیٹھ کا سا رشتہ ہو گیا تھا۔ وہ اکثر میری خیر خبر لینے آ جاتے۔ ان کی بی بی گھنٹوں میرے ساتھ پکانے ریندھنے سینے پرونے کی باتیں کیا کرتیں۔ بے چاری مجھ سے بالکل جٹھانی والا شفقت کا برتاؤ کرتیں۔ یہ میاں بیوی لاولد تھے۔ بڑا اداس، بے رنگ، بے تکا سا غیر دلچسپ جوڑا تھا۔

ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں!

کالج میں نئی امریکہ پلیٹ ناک چڑھی پرنسپل سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ اگر وہ سیر تو میں سوا سیر۔ میں خود ابوالحسن تانا شاہ سے کون کم تھی۔ میں نے استعفا کالج کمیٹی کے سر پہ مارا، اور پھر سنت نگر لاہور واپس آ گئی۔ میں پڑھاتے پڑھاتے اکتا چکی تھی۔ میں کوئی وظیفہ لے کر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے باہر جا سکتی تھی۔ مگر اس ارادے کو بھی کل پر ٹالتی رہی۔ کل امریکنوں کے دفتر جاؤں گی جہاں وہ وظیفے بانٹتے ہیں۔ کل برٹش کونسل جاؤں گی۔ کل ایجوکیشن منسٹری میں اسکالرشپ کی درخواست

نہ بھیجوں گی۔

مزید وقت گزر گیا۔ کیا کروں گی کہیں باہر جاکر۔ کون سے گڑھ جیت لوں گی، کون سے کدّو میں تیر مار لوں گی۔ مجھے جانے کس چیز کا انتظار تھا، مجھے معلوم نہیں۔

اس دوران میں ایک روز وقار بھائی میرے پاس حواس باختہ آئے اور کہنے لگے "تمہاری بھابی کے دماغ میں پھر سودا اُٹھا۔ وہ ویزا بنوا کر انڈیا واپس چلی گئیں۔ اور اب کبھی نہ آئیں گی۔"

"یہ کیسے؟" میں نے ذرا بے پروائی سے پوچھا اور ان کے لئے چائے کا پانی اسٹوو پہ رکھ دیا۔

"بات یہ ہوئی کہ میں نے انہیں طلاق دے دی۔ ان کی زبان بہت بڑھ گئی تھی۔ ہر وقت ٹر ٹر۔ ٹر ٹر ــــــ" پھر انہوں نے سامنے کے کھرّے پلنگ پہ بیٹھ کر خالص شوہروں والے انداز میں بیوی کے خلاف شکایات کا ایک دفتر کھول دیا اور خود کو بے قصور اور حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہے۔

میں بے پروائی سے یہ ساری کتھا سُناکی۔ زندگی کی ہر بات اس قدر بے رنگ، غیر اہم، غیر ضروری اور بے معنی تھی ــــــ

کچھ عرصے بعد وہ میرے یہاں آکر بڑبڑائے:

"نوکروں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کبھی اتنا بھی تم سے نہیں ہوتا کہ آکر ذرا بھائی کے گھر کی حالت ہی درست کر جاؤ۔ نوکروں کے کان اینٹھو۔ میں اسکول بھی چلاؤں اور گھر بھی۔" انہوں نے اس انداز سے شکایتاً کہا گویا ان کے گھر کا انتظام کرنا میرا فرض تھا۔

چند روز بعد میں اپنا سامان باندھ کر وقار صاحب کے کمروں میں منتقل ہو گئی۔ اور ناچ سکھانے کے لئے اُن کی اسسٹنٹ بھی بن گئی۔

اس کے مہینے بھر بعد پچھلے اتوار کو وقار صاحب نے ایک مولوی بلوا کر اپنے

دو چُرکٹوں کی گواہی میں مجھ سے نکاح پڑھوالیا۔

اب میں دن بھر گھر کے کام میں مصروف رہتی ہوں ـــــ میرا حسن و جمال ماضی کی داستانوں میں شامل ہو چکا ہے۔ مجھے شور و شغب پارٹیاں ہنگامے مطلق پسند نہیں۔ لیکن گھر میں ہر وقت "چاچا" اور "کلپسو" اور راک اینڈ رول کا شور مچتا رہتا ہے۔ بہرحال۔ یہی میرا گھر ہے۔

میرے پاس اس وقت کئی کالجوں میں کیمسٹری پڑھانے کے آفر ہیں۔ مگر بھلا خانہ داری کے دھندوں سے کہیں فرصت ملتی ہے۔ نوکروں کا یہ حال ہے کہ آج رکھو۔ کل غائب۔ میں نے زیادہ کی تمنا کبھی نہیں کی۔ صرف اتنا ہی چاہا کہ ایک اوسط درجے کی کوٹھی ہو۔ سواری کے لئے موٹر۔ تاکہ آرام سے ہر جگہ آجا سکیں۔ ہم چشموں میں بے عزتی نہ ہو۔ چار ملنے والے آئیں تو بٹھانے کے لئے قرینے کا ٹھکانہ ہو اور بس!

اس وقت ہماری ڈیڑھ دو ہزار ماہوار آمدنی ہے۔ جو دو میاں بیوی کے لئے ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ انسان اپنی قسمت پہ قانع ہو جائے تو سارے دُکھ آپ سے آپ مٹ جاتے ہیں۔

شادی کر لینے کے بعد لڑکی کے سر کے اوپر چھت سی پڑ جاتی ہے۔ آج کل کی لڑکیاں جانے کس رَو میں بہہ رہی ہیں۔ کس طرح یہ لوگ ہاتھوں سے نکل جاتی ہیں۔ جتنا سوچوں عجیب سا لگتا ہے اور حیرت ہوتی ہے۔

میں نے تو کبھی کسی سے فلرٹ تک نہ کیا۔ خوشوقت، فاروق اور اس سیاہ فام دیوزاد کے علاوہ جو میرا شوہر ہے، میں کسی چوتھے آدمی سے واقف نہیں۔ میں شاید بدمعاش تو نہیں تھی۔ نہ معلوم میں کیا تھی اور کیا ہوں ـــــ ریحانہ، سعدیہ، پریما اور یہ لڑکی جس کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر دہشت پیدا ہوئی، شاید وہ مجھ سے زیادہ اچھی طرح مجھ سے واقف ہوں۔

اب خوشوقت کو یاد کرنے کا فائدہ؟ وقت گزر چکا۔ جانے اب تک وہ بریگیڈیر میجر جنرل بن چکا ہو آسام کی سرحد پر چینیوں کے خلاف مورچہ لگائے بیٹھا ہو یا

ہندوستان کی کسی ہری بھری چھاؤنی کے میس میں بیٹھا مونچھوں پر تاؤ دے رہا ہو، اور مسکراتا ہو۔ شاید وہ کب کا کشمیر کے محاذ پر مارا جا چکا ہو۔ کیا معلوم۔

اندھیری راتوں میں میں آنکھیں کھولے چپ چاپ پڑی رہتی ہوں۔ سائنس نے مجھے عالمِ موجودات کے بہت سے رازوں سے واقف کر دیا ہے۔ میں نے کیمسٹری پر ان گنت کتابیں پڑھی ہیں۔ پہروں سوچا ہے۔ پر مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ اندھیری راتوں میں مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔

خوشوقت سنگھ۔ خوشوقت سنگھ۔ تمہیں اب مجھ سے مطلب؟

تمت بالخیر